



تخریج شدہ ایڈیشن

مُحَسَّن انسانیّت کی میراث پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



# سیر النبوی

صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ سید لیجان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

مکمل شہ اسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب .....

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ اوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

### ☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

[kitabosunnat@gmail.com](mailto:kitabosunnat@gmail.com)

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

ترغیب و ترہیب  
مکتبہ المدینہ

حصہ پہلوا

# سیرۃ النبی

مخبر انسانیٹ کی بریٹ پر منفرد اسلوب کی خاں ایک جامع کتاب

اس حصے میں منصب نبوت کے بیان کے ساتھ ساتھ اسلام سے پہلے دنیا بالخصوص عرب ممالک کی تہذیب و اخلاقی حالت پر تفصیلی بحث ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبوت محمدی ﷺ نے ان کی اخلاقی و مذہبی اصلاح کا عظیم الشان فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد کا بھی تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔



تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید لیجان ندوی

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ المدینہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

سیدنا ابی بنی

کتاب

علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

تالیف

مجموعہ درویشی

ناشر

اکتوبر 2012ء

اشاعت

قیمت

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالتفصیل: رحمان مارکیٹ، قریبی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973-042-37232369 فیکس

پتہ: سمنٹ سٹریٹ، ٹیکسٹائل ٹیبل پیرول پب کوٹوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2034256, 041-2631204

E-mail: maktabaislamiapk@gmail.com

## فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
52	نبی علم	15	دیباچہ
52	علم انسانی کے ماخذ	18	دیباچہ طبعی ثانی
	ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے	19	مقدمہ
54	مراتب	19	منصب نبوت
55	غیر مادی علم	19	کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنامے
59	علم غیب	20	نبی اور صلح اور حکیم
61	غیب کی حقیقت	22	نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ
64	وحی اور ملکہ نبوت	23	پہلا طریقہ
66	کتاب اور سنت	23	دوسرا طریقہ
66	وحی مقلو اور وحی غیر مقلو	24	تیسرا طریقہ
69	احادیث، قرآن کا بیان ہیں	25	نبی کی ضرورت
69	الہام و اجتہاد و حکمت	26	نبی کی عصمت
70	اجتہاد نبوت	27	نبی کی محبوبیت
	ساقواں بحث: احادیث نبوی سے	27	مصلحین
	شریعت کے اخذ کرنے میں علوم	27	مصلحین کی اقسام
72	نبوی ﷺ کے اقسام	28	نبی کی دو بعثتیں
75	عصمت اور بے گناہی	29	بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب
82	بعض شبہات کا ازالہ	29	بعثت کا زمانہ
85	نکتہ	30	نبی کی یقینی کامیابی
89	نبی کی بشریت	38	ایک شبہ اور اس کا جواب
96	اجتہاد نبوی میں خطا	42	نبی اور غیر نبی کے امتیازات
97	اس خطا کے معنی	47	نبوت کے لوازم اور خصوصیات
98	پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الہی	49	وہی استعداد

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
153	شبِ ظلمت	98	پہلا واقعہ
	پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی	99	دوسرا واقعہ
153	مذہبی اور اخلاقی حالت	102	تیسرا واقعہ
	ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی	103	چوتھا واقعہ
154	حالت کیا تھی؟	103	پانچواں واقعہ
154	مجوس فارس	105	ایک غلط استدلال
157	عیسائی روم	108	عقل بشری
164	ہندوستان	110	ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت
166	یہود	111	حکمت
	ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و	122	کتاب و حکمت کی تعلیم
176	اخلاقی حالت	123	علم
176	خدا کا اعتقاد	125	علم و حکم
177	ملائکہ کی الوہیت	128	شرح صدر
178	جنات کی الوہیت	132	تہمین کتاب
179	بت پرستی	134	ارائت
184	ستارہ پرستی	137	رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے
184	جن اور شیاطین اور بھوت پلیت	138	ترکیہ
189	اوبام پرستی	139	نور
190	جنگ جوگی	139	آیات و ملکوت کی رویت
191	شراب خوری	140	سامع غیب
200	قمار بازی	140	تبلیغ و دعوت
201	سود خوری	143	ایک شبہ کا ازالہ
202	لوٹ مار	147	انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ
203	چوری	148	نبوت کی غرض و غایت
205	سفاکی دے جی و وحشت	151	تائید و نصرت
206	زنا اور فواحش	152	خاتمہ

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
230	قبائل کی خانہ جنگیاں	207	بے شرمی و بے حیائی
233	سیاسی مشکلات	207	عورتوں پر ظلم
236	ذریعہ معاش	209	دشنت و جہالت
238	رفع شک	211	عربوں کی خصوصیات
	تبلیغ نبوی اور اس کے اصول اور اس کی	211	خیر الامم بننے کی اہلیت
240	کامیابی کے اسباب	211	صحت نسب
240	فریضہ تبلیغ	212	کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے
241	تبلیغ کی اہمیت	213	حکوم نہ تھے
242	اس کی وسعت	213	کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے
244	تبلیغ کے اصول	213	وہ زمین کے وسط میں آباد تھے
245	قول لین	214	بعض اخلاقی خوبیاں
245	اعراض اور قول تبلیغ	214	شجاع و بہادر تھے
246	تیسیر و تیشیر	214	پر جوش تھے
246	تدریج	214	حق گو تھے
247	تالیف قلب	214	عقل و دانش والے تھے
247	دعوت عقل	215	ذہن اور حافظہ کے تیز تھے
249	مذہب میں زبردستی نہیں	215	فتیاض تھے
252	میدان جنگ میں تبلیغ	215	مساوات پسند تھے
255	مسلح تبلیغی جماعتیں	216	عملی تھے
256	تبلیغ و دعوت کی تنظیم	216	ان اوصاف کی مصلحت
257	مہانوں کی تعلیم و تربیت	218	صحیح سعادت
257	دعوت بالقرآن	218	ایک قوم کا انتخاب
258	اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب	219	اصلاح و ہدایت کی مشکلات
259	قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی	219	جہالت
261	اشاعت اسلام کے اسباب و ذرائع	224	آبائی دین و رسوم کی پابندی
267	ایک ضروری نکتہ	228	توہم پرستی

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
315	اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل	267	موانع کا ازالہ
324	توحید پر عقلی دلیلیں		اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ
325	توحید کی تکمیل	274	کام
326	خدا کی حقیقی عظمت	276	تعلیمات نبوی کی ہمہ گیری
328	انسان کا مرتبہ	277	اسلام کے چار حصے
332	خدا کا جامع اور مانع تخلیل	278	عقائد
334	اسما و صفات	278	عقائد کی حقیقت اور اہمیت
244	صفات جمالی	285	اللہ تعالیٰ پر ایمان
346	صفات جلالی	285	اصلاح عقائد
347	نکتہ	286	تعدد خدا کا ابطال
347	صفات کمالی	287	بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا
348	صفات وحدانیت	290	درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد
348	صفات وجودی	291	خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں
348	علم	293	حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے
349	قدرت	294	غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم
350	نکتہ	294	صفات الہی کی توحید
350	تتزیہہ	296	مخفی قوتوں کا ابطال
351	ان تعلیمات کا اثر اخلاقی انسانی پر	298	اوبام و خرافات کا ابطال
357	خدا کا ڈر اور پیار	300	کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید
357	محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم	307	اجرام سماوی کی قدرت کا انکار
361	محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	308	غیر خدا کی قسم سے روکنا
363	تعلیمات اسلامی میں محبت الہی کے مظاہر	309	خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں
377	فرشتوں پر ایمان	310	مشتبہات شرک کی ممانعت
377	ملائکہ کے معنی	311	قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا
378	ملائکہ کا تخلیل مذاہب قدیمہ میں	312	ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے
378	ملائکہ کا تخلیل فلسفہ میں	315	توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان



صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
405	تمام کتب الہی پر ایمان لانا ضروری ہے	378	یونانی مصری فلسفہ
407	انبیائے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	378	صائے
407	چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	378	اسلام میں فرشتوں کی حقیقت
408	اس عقیدہ کا اثر سیاسیات عالم پر	380	اس عقیدہ کی عقلی حیثیت
408	اقوام عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق	381	آیات و احادیث میں ملائکہ کا ذکر
408	مسلمان	381	ملائکہ کے فرائض
409	اہل کتاب	389	فلسفہ و مذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی
409	شبہ اہل کتاب	392	فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد
409	کفار اور مشرکین	394	رسولوں پر ایمان
410	وحدۃ الادیان	394	ایک عام غلط فہمی کا ازالہ
410	تمام سچے مذاہب ایک ہیں	394	نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں
410	دین اور شرع، منک منہاج کا فرق	395	تمام دنیا میں پیغمبر آئے
411	صحیفے و تقانوفتاً کیوں نازل ہوئے	396	تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف
411	وحدۃ دین پر قرآن کی شہادت	396	پیغمبروں میں تفرق کی ممانعت
412	وحدۃ دین کی دعوت عامہ	398	پیغمبروں کی غیر محدود تعداد
413	دینِ قیم	399	مختلف فیہ پیغمبروں کی رسالت کا اقرار
413	اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد	399	پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار
414	دین ہمیشہ ایک رہا	399	پیغمبروں کا منصب اور فرائض
414	شرع اور منہاج میں تبدیلی ہوئی	400	پیغمبروں کی عصمت
414	اس کی مثالیں	401	قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ
415	تبدیل قبلہ	402	وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے
415	خانہ کعبہ کے حج کی تعیین	402	ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول
415	یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل	403	انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ
415	کرنے کی ہدایت	405	کتاب الہی پر ایمان
416	مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	405	کتاب الہی پر ایمان لانے کا مقصد
416	صحیفہ محمدی نے اگلی کتابوں کی تصدیق کی	405	اس عقیدہ کا تکمیل پہلو

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
424	حضرت موسیٰ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	416	اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر ہوا کی پیروی کی
425	حضرت عیسیٰ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	417	حدود میں شریعتوں کا اختلاف غیر اہم ہے
425	موجود الامم (ﷺ) کی آمد اور اس کا دعویٰ	417	یہود و نصاریٰ فردی اختلاف پر ایک دوسرے کو باطل کہتے تھے
425	وحی الہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	417	وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت کی دعوت دیتے تھے
425	تکمیل دین کے اثرات و مظاہر	417	اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی جانب
426	قرآن کا تکمیل ہونا	417	اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب
426	قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہونا	418	قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے
426	قرآن محفوظ ہے اور رہے گا	419	ایمان و عمل کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے
426	اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے بری نہیں	419	اسلام کا عمل تمام رسولوں کی تصدیق ہے
426	قدیم مذاہب داغی نہ تھے اس لیے داغی حفاظت کا وعدہ نہ تھا	419	یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے، اس لیے اصل اسلام سے ہٹ گئے
426	قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر	420	یہود و نصاریٰ کا حسن عمل
427	قرآن کے لفظ و عبارت و معانی کی حفاظت کے لیے وعدہ الہی	420	اسلام کا اصل الاصول توحید کامل و رسالت عمومی ہے
427	قرآن کا غالب ہونا	422	اسلام کا ہدایت تامہ ہونا
427	ختم نبوت	422	توحید کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی مستحق نہیں
428	وحدت ادیان اور دین اسلام	422	نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ
428	وحدت دین کا منشا اسلام ہے	422	دعوت محمدی ﷺ میں ہدایت کی بشارت
428	صحیفہ محمدی ﷺ نے اہل کتاب کو وحدت دین کی دعوت دی	424	اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوت محمدی ﷺ
429	وحدت دین کی حقیقت صحیفہ محمدی میں	424	کیوں پیش کی گئی
430	پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	424	تکمیل دین
430	یہ اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی ہے	424	قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
437	میں	430	آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم
437	عالم خواب کے لذائذ و آلام کے فلسفیانہ اسباب و علل	431	آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے
437	بھولے ہوئے احساسات و معلومات کا خواب میں متشکل ہو کر نظر آنا	431	قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے
437	اچھے اور برے اعمال کے نقوش ذہن انسانی کے گوشوں میں	432	آئندہ زندگی کے دور یعنی برزخ و بعثت تو راہ و انجیل میں برزخ و بعثت کی تفصیل نہیں
437	تمثیلی خواب اور اس کی مثالیں	432	اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل
437	جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی بیشی سے خواب میں ان کے متناسب مجسم شکلیں اور ان کی مثالیں	432	اسلام میں تین دور ہائے حیات دنیا، برزخ اور قیامت
438	اعمال انسانی کا خواب میں اپنے متناسب قالب میں مجسم ہونا اور ان کی مثالیں	432	ان تینوں دوروں میں فرق
438	اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	433	۱۔ برزخ
440	اعمال کی تمثیلات احادیث میں	433	قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی
441	گناہوں کی تمثیلی سزائیں	433	قبر، برزخ کا عرف عام ہے
441	آنحضرت ﷺ کے ایک روایے صادقہ میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزائوں کے مناظر	433	موت و حیات کی منزلیں
442	ان تمثیلات کی تعبیر و تشریح	433	قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر
443	علم انفس سے انسان کی لاعلمی	434	دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریح
443	تصوری یقین اور خارجی وجود کا باہمی تعلق	434	عالم برزخ کی کیفیت
443	قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں	434	نیند اور موت کی مشابہت
443	علم الیقین و عین الیقین	435	نیند اور موت کا فرق
443	علم الیقین کے حصول کا ذریعہ ایمان ہے	435	قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے
443	علم الیقین کے ذریعہ دوزخ کا مشاہدہ دنیا میں	435	برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے
		436	قرآن میں دوسری زندگی کے لیے بعثت کا لفظ
		436	خواب میں لذت و الم
		436	خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہونا
			عالم خواب کی لذت و الم کا خاتمہ بیداری میں
			اور بیداری کی لذت و الم کا خاتمہ عالم خواب

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
455	جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت والہم کا احساس ہوتا ہے	444	موت کے بعد حجاب مادیت کا اٹھنا اور اعمال کے تمثیلی نتائج کو کسی حد تک دیکھنا
455	بعض سعید روہیں جسم خاکی کی شکل کی قید سے آزاد کردی جاتی ہیں	445	قیام روز جزا پر تمام راز ہائے سربستہ کا فاش ہو جانا
455	مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	445	احوال برزخ کا عین الیقین
455	سوال و جواب	445	موت کے بعد عالم برزخ کی ابتدا
455	قبر میں فرشتوں کا توحید و رسالت کے متعلق سوال	446	عالم برزخ میں جزا و سزا کے پس پردہ مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں
455	قبر کے سوال و جواب کا ذکر قرآن مجید میں	447	موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت
457	سوال و جواب کا اصل مفہوم	447	موت کے لیے قرآن مجید میں خدا کی طرف بازگشت کی اصطلاح اور اس کا مفہوم
457	برزخ میں ارواح کا مسکن	447	اس وقت کا سماں
460	آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل	449	موت کے سال کا خاکہ قرآن مجید میں
460	قیامت اور جزائے اعمال	449	جسم سے روح کی علیحدگی کے بعد سزا کا دور
460	کیا کبھی دنیائے حیات پر بھی موت طاری ہوگی	449	سزا قانون عمل کے مطابق انسانی اعمال کا نتیجہ ہے
460	نظام کائنات کی بربادی کی پیشین گوئی اہل سائنس کی طرف سے	449	نیوکلیاروں کو بشارتیں
461	قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں	450	برزخ کا عذاب و راحت
461	قیامت	450	برزخ میں عذاب و ثواب کے مناظر
461	قیامت کے نام قرآن میں	451	برزخ اور اس کے عذاب و ثواب کا تذکرہ
463	قیامت کے اوصاف	451	قرآن مجید میں
464	قیامت میں فساد نظام ہوگا	453	قبر کی اصطلاح
464	اس کی شہادتیں قرآن مجید سے	453	احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے
466	بعد قیامت ایک نئے آسمان اور نئی زمین کی تعمیر	454	قبر کا مفہوم
466	پچھلی دنیا کے نتائج پر اس کی بنا	454	قبر ارواح و نفوس کی دنیا ہے
467	قیامت کی حقیقت	455	قبر کی روہیں جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی میں مشتمل ہوتی ہیں
470	صور قیامت		

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
488	”وجود“ کے موجودہ قوانین فطرت اور ان کے خصوصیات ولوازم	470	عربوں کا انکار قیامت سے
489	مادی دنیا کے قوانین فطرت اور سلسلہ علت و معلول اسی مادی عالم کے ہیں	471	اسی لیے اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا
489	ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں	472	عقیدہ قیامت اصول دین کیوں ہے؟
489	اصول جزا	473	قیامت پر قرآنی دلائل
489	اصول فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں	478	حشر جسمانی
490	اعمال کے لوازم و نتائج	478	روحانی زندگی کا تصور نئی جسمانی زندگی سے زیادہ دشوار ہے
490	عقاب و ثواب رد عمل ہے	479	حشر جسمانی ہوگا
491	حصول راحت کا اصول	480	جسم و جسد
493	نامہ عمل	480	کیا کوئی نیا جسمانی پیکر ہوگا
493	کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتی	480	نیا جسمانی پیکر جسم خاکی کی خصوصیات ولوازم سے الگ ہوگا
493	اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں	480	”خلق جدید“
493	قرآن مجید میں اس اصول کی تشریح اور اس پر شہادتیں	481	ذمہ داری روح پر ہے
495	اعضا کی شہادت	482	دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے
497	میزان	483	اخروی جسم کیسا ہوگا؟
498	حساب	484	جزا اور سزا
498	جنت و دوزخ	484	جزا اور سزا دیگر مذاہب میں
498	جنت انسان کی وراثت ہے	487	عالم آخر کا فہم و ادراک
498	حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	487	عالم آخر کو مادی دنیا کی زبان و محاورات میں سمجھا گیا ہے
499	آدم اور بنو آدم کی اصلی جگہ جنت ہے	488	اس طرز افہام سے فلسفی دعویٰ دونوں تشریف پاتے ہیں
499	جنت کے دو درخت، نیک و بد کی پہچان کا اور زندگی جاوید کا	488	اخروی وقائع کے سمجھانے کے لیے مادی الفاظ کا استعمال

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
518	عذاب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے		آدم علیہ السلام کو نیک و بد کی شناخت کے درخت سے روکا گیا
519	انسان کی تخلیق رحمت کے لیے ہوئی	500	شیطان نے حیات جاوداں کا درخت کہہ کر نیک و بد کی شناخت کے درخت کو بتا دیا
521	دوزخ		حیات جاوداں سے مقصود کیا ہے
521	دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے	500	نیک و بد کی تمیز ہی شرعی تکلیف کا باعث ہے
	گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب اس کے نتیجہ	500	آدم کو نیک و بد کی تمیز کا فطری الہام
521	بد کا اصطلاحی نام ہے	500	انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول کرنا اور
521	دوزخ کی مثال شفا خانہ ہے	500	حیات جاوداں کا حصول سعی و عمل پر موقوف ہونا
521	دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	500	زمین پر بنو آدم کی چار چیزوں کھانے پینے پسنے اور اوڑھنے کی ضروریات کا پیدا ہونا
523	گو یا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	502	مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز طریقوں کی تلقین کی
524	دوزخ میں رحمت الہی کا ظہور اور نجات		جنت کی وراثت کا وعدہ الہی
524	اس کی تصریحات احادیث میں	502	انسانی جزا و سزا کے تین گھر
527	شرک و کفر کی بخشش نہیں	503	انسان کا پہلا دارالجزا یعنی دنیا
528	کیا دوزخ کی انتہا ہے؟	504	مگر یہ دارالجزا فانی ہے
	دوزخ رحمت الہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرد	507	یہ دارالجزا دارالاصلاح بھی ہے
528	ہو جائے گی	508	انسانوں کی تنبیہ و اصلاح کے مراتب
528	اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	509	نیکی سے برائی کا کفارہ
529	دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں مشیت پر ہے	509	توبہ کفارہ ہے
	کفار و مشرکین کے عذاب کی انتہا مشیت الہی	510	مصائب کی تنبیہ اور کفارہ
529	پر موقوف ہے	512	عذاب الہی کا مقصد
	قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل	514	عذاب برزخ بھی کفارہ ہے
530	وجود پر دلالت نہیں کرتی	515	عذاب دوزخ کفارہ گناہ ہے
	قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی	517	
531	تصریح کی گئی		
531	قرآن مجید سے اس کی تصریح		
531	اس کی شہادت حدیثوں میں		
532	دفع شبیہ		

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
554	جنت کے عیش و مسرت کی تعبیر آسمانی بادشاہی سے		قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ کے
554	عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	532	دوام کا شبہہ
555	آسمانی بادشاہی کے اجمال کی اسلامی تفصیل	533	اس شبہہ کا ازالہ
	جنت کے لیے باغ کا استعارہ کیا عرب کے لیے ہے	534	چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تصریح
556	اس استعارہ میں ایک نکتہ	535	ان آیات کا مفہوم
557	سامان جنت کے دنیاوی نام	535	اللہ تعالیٰ کے وعدہ عذاب و ثواب میں فرق
	جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر حقائق	536	مشرکین و کفار کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں
557	اس کی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	536	عقیدہ کفارہ اور عقیدہ کرم اور عقیدہ مغفرت
559	جنت کی سرتیں اعمال کی تمثیل ہیں	537	عذاب طویل کا سبب
559	اس کی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	540	مشرک و کافر کا آخر انجام؟
564	لطف و مسرت کا تصور	543	جمہور کے نزدیک عذاب دوزخ کا دوام
564	لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	543	بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے
564	جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی	543	تمثیلی سزا کے معنی
565	جنت، جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں	543	اس کی مثالیں قرآن مجید و احادیث سے
567	جنت، جہاں رشک و حسد نہیں	545	دوزخ کی جسمانی سزائیں
567	وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	545	جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے
568	جنت ارتقائے روحانی ہے	548	دوزخ میں روحانی سزائیں
	مسئلہ ارتقا کے اصول بقائے صلح کا عمل روحانی	548	ان کی تصریح قرآن مجید سے
569	مدارج کے ارتقا میں	550	جنت
570	امن و سلامتی کا گھر	550	جنت کے نام
571	مقام رحمت	550	جنت کا دوام
571	مقام نور	550	اس کی تصریح قرآن مجید میں
572	مقام رضواں	554	وائی قیام سے اہل جنت کا جنت سے گھبرانا ان کی جہلت و فطرت کے خلاف ہوگا
574	مقام طیب و طاہر	554	غیر فانی بادشاہی

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
	قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں یا	575	مقام تسبیح و تہلیل
589	تو خاموشی یا جبر کی تلقین	576	صبح و شام کی روزی
589	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز کو ظاہر کیا	576	مقام قرب
589	بیک وقت دو صدقاتیں	577	دیدار الہی
	صحیفہ محمدی میں ان دونوں صدقاتوں کی تفصیل	578	ان تعلیمات کا عملی اثر
590	اور ان کی تشریح	579	عرب کا ایمان و یقین اور صحابہ کی نشیبت الہی
	بدایت و ضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط	582	قضا و قدر
591	فہمی کا ازالہ	582	کیا عقیدہ قضا و قدر ایمانیات میں ہے
592	”خیر و شر“ کا مفہوم اسلام میں	582	عقیدہ قضا و قدر کا حاصل
593	”اگر خدا چاہتا تو ان کو بدایت دیتا“ کی تفسیر	582	اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں
593	بندہ کی مشیت	582	خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم نے اس کی کیا
594	اللہ کی گمراہی کن کے لیے ہے؟	583	تکمیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے
595	نتیجہ بحث	584	اصطلاح قدر و قضا کی تشریح
596	ایمان کے نتائج	585	اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت
596	خلاصہ مباحث	585	عقیدہ قضا و قدر کی توضیح
596	ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے	585	عقیدہ قضا و قدر کا نتیجہ بہت سستی و دون بھمتی
596	اسلام میں ایمان و عمل کی جامعیت	586	نہیں
596	درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے	586	اس کا نتیجہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے
597	اہل ایمان کی عملی شناخت	587	غلط فہمی کا ازالہ
600	تمام نیکیاں صرف ایک جز ایمان کی شاخیں ہیں	588	قضا و قدر اور سعی عمل کی باہمی تعلقیت
600	ایمان کے بعد عمل کی ضرورت	588	پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں
600	ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں	588	خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے
600	خاتمہ	589	جبر و قدر
		589	جبر و قدر کا مسئلہ لائیکل



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### دیباچہ طبع اول

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ  
وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

اے باز کن در معانی  
سرچہ از تو گمان برم بچونی  
شاه رسل و شفیع مرسل  
سلطان مالک رسالت  
برما بکلید آسمانی  
آن من بوم و تواز آن برونی  
خورشید پسین و نور اول  
طغرائے صحیفہ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب ”سیرۃ النبی ﷺ“ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع ”منصب نبوت“ ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دو تہیں درپیش تھیں، شرح و بسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کی تعلیمات و ارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے ① عقائد، ② عبادات، ③ اخلاق اور ④ معاملات، خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق و فوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا جس میں ہم ان شاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص تو انہیں نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراج ترقی شریعت اسلام کا پایہ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے صرف عرب

جاہلیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کا قلم پر ہے۔ ﴿وَمَا أَرْبِيْ نَفْسِيْ ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَكْثَارٌ بِالسُّؤۡءِ﴾ (۱۲ / بسوسف: ۵۳) کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر ﷺ کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلام کی تکمیل شان نمایاں ہو جائے۔ ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (۵ / المائدہ: ۳) ان کی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لیے اس خازن سے کسی آبلہ پا کا سلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں، چلے والا تو تھک کر چور ہے۔ اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون و مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اُمّت باللہ و ملائکہ و کتبہ و رُسُلہ و الیوم و الآخر و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ میں مذکور ہیں یعنی ”خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان۔“ چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔ میں نے

اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم، صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيٌّ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۷۸)

”جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔“

﴿وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳۷)

”اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔“

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا إِنْ كُنَّا بِإِثْمِنَا إِذْ نَسِيْتْنَا آيَاتِكَ مِنْ غَيْرِ غَفْلَةٍ أَوْ نَسِيْتْنَا آيَاتِكَ مِنْ غَيْرِ غَفْلَةٍ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۸۶)

”ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرماتا۔“

ابن نامہ کہ خامہ کرد بنیاد توفیق قبول روزیش باد

طالبِ رحمت

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

(۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

## دیباچہ طبع ثانی

### سیرت النبی ﷺ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرادل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راسنہ میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمد للہ والمنة کہ سوائے دوزخ کی ابدیت و غیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علما اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملائے اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و مشنگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیت نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

واعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا.

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے، تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ

آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لیے ۶۸۶ صفحات کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحات تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سامنا مشکل تھا، اس لیے گوصفوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے گرضفہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے، تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے، تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع  
سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

## منصب نبوت

کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعات زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلہ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزرگ شمشیر منادیں اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریزیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجاز نبوت، حسن تدبیر، لطف اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پر امن نظام قائم ہو گیا بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گونہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں وہ اتفاقی حوادث ہیں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرۃ مبارکہ کے اصلی واقعات اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سر تاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعہ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اہام کو مٹانا، اخلاقی فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو ہونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفیق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی پسند و معظمت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباود شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی

اصلاح، فنِ اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الہی کا اظہار و عرض اور تہذیبِ نفوس کی معراجِ اخیر تھی اور یہ سب اسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے پیش نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قہرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے معارج القدس ؑ میں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کو چوں سے باخبر ہیں، اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

”نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ

الہی اور مہربت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ؑ

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔“

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا ۖ مِّنْ أَمْرِنَا ۗ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ

وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۗ﴾

ؑ معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔ یہ ضمیمہ عربی عبارت میں الکلام کے قدیم ایڈیشن مطبوعہ نامی پریس کان پور ۱۹۰۳ء (ص: ۲۷۸، ۲۷۹) میں شامل تھا مگر بعد کے ایڈیشنوں میں صرف اردو خلاصہ ہی شامل رہا۔

ؑ معارج القدس بحوالہ ضمیمہ الکلام، ص: ۲۶۰، ۲۶۱۔

ؑ امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری کر دی ہے۔

(۴۲/ الشوزی: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی، تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوچھائیں۔“

اس موقع کے لیے صریح آیت یہ ہے:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ﴾ (الجمعة: ۴)

”یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔“

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت ظلی سے پاک ہوں نفس میں آغاز وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیا کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لیے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح نبوت نوع انبیا کے لیے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشاء نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ طے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کیا، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے تو راہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرامیں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدہ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی وحی کے بعد آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے اسی لیے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا:

﴿طهٓ مَا اَنْزَلْنَا عَلٰٓيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰٓ﴾ (طہ: ۱، ۲)

”اے پیغمبر! ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔“

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسن صورت، اعتدال مزاج، نشوونما کی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، کرم اخلاق، نیکی، متانت، سنجیدگی دوستان الہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریادری، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ ﴿٥٣﴾ (النجم: ٥٣)

”تمہارا ساتھی (پیغمبر) گمراہ نہ ہوا اور نہ بہکا۔“

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہروی سے پاک ہوتا ہے:

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۚ ﴿٧٣﴾ (النجم: ٧٣)

”اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔“

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں، اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، باایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفا پیشہ، بدخوا اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں: ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر



عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ إِنَّمَا آتَا بَشَرًا قَلْبًا لَّمْ يُؤْتَىٰ الْإِنۡسَٰنَ ۝۱۸﴾ (الکہف: ۱۱۰)

”میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔“

و یکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں فکری، قولی، عملی ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بدابہت غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے، فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ: نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصطلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تمناع کہتے ہیں اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے لیے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح و قربت اولاد و اعزاء اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمناع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی ولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اس تعاون اور تمناع کے اصول ضروری ہے کہ مرتب و محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الہی

سے بن سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو محال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات انہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور امر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں:

① چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

② ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو مبدوم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گوطبعی ہیں، تاہم ان کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا:

﴿وَأُولَٰئِكَ فِي كَلِمٍ سَمَاءٍ أَمْرَهُمْ﴾ (٤١/ حَمَّ السَّجْدَةِ: ١٢)

”خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔“

③ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں

نہیں آسکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے راہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

④ خدا کے حکم و قسم کے ہیں تدبیری اور تکلفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَالْقَائِسُ وَالْقَمَرُ وَالنَّجْمُ مَسْخَرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْآخِرُ ۗ﴾

(۷/ الاعراف: ۵۴)

”اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع دار ہیں اسی کا نام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔“

تکلفی حکم صرف انسان کے لیے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱)

”اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔“

مقدمات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لیے مرنج کی ضرورت ہے۔

اختیاری ہیں، اس لیے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کے متحمل ہیں، اس لیے راہنما کی ضرورت ہے، اسی راہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا جو تکلفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسی ہی نفوس کے ذریعہ سے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے جیتہ اللہ البالغہ کے چھٹے بحث کے دو ابتدائی بابوں میں اسی پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

### نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بھیمی اور ملکوئی، کھانا، پینا، شہوت، حرص، طمع، استیلا و جبر وغیرہ افعال بھیمی قوت کے آثار ہیں اور غور و فکر، علم و معرفت، حسن اخلاق، صبر و شکر، عبادت و طاعت وغیرہ ملکوئیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بھیمی قوت اس کی ملکوئی قوت کے تابع ہو اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوئیت ہونے کے فائدے اور گناہ و عصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر، موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص و طمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تور تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت

احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندرونی وجدان و احساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے اس لیے نوع انسان کو ایسے صحیح راہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آتش اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق و روحانیت اور ملک و ملت کے مصالح و فوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

### نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس راہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اس طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے بجز اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ

ناطق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہ الہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی ”بحث نبوت“ کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں، ✽ جس کا حاصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخص اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبیر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنان عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لیے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کی اقسام

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل

✽ حجة الله البالغة، ج ۱، ص ۶۵ تا ۶۶۔

ہے اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملائے اعلیٰ کا نزول ہو وہ اس سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اس کا نام ہادی اور مزی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لیے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بد اعمالی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا ہوشیار کرنے والا) ہے اور جب حکمتِ الہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہِ الہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

### نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (٦٢ / الجمعة)

”وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں، انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔“

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

(٣ / آل عمران: ١١٠)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لائی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

﴿لَيَكُونَنَّ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُونَ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج: ۷۸)

”تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔“

اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو فرمایا ((فَلَا تَمَّا بُعِثْتُمْ مَيْسَرِينَ وَكَمْ تَبِعْتُمْ مَعْسَرِينَ)) ﴿تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہوتی کرنے والے بنا کر نہیں۔“ آحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیا آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی کمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیے حکمت الہی کا اقتضا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لیے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لیے بارگاہ الہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیے قائم کی جائے، تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے، تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح

بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول فی المسجد: ۲۲۰؛ کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ:

یسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۸؛ مسند امام احمد، ج ۲، ص ۲۳۹۔

ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی یا کسی قوم کے متعلق قضائے الہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے، اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن میں ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۚ وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ

الغَلِيُونَ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۷۱-۱۷۳)

”اور (اے پیغمبر) ہماری بات بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔“

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جاسکتا ہے جس طرح نفسیات اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیات راہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ علیہ السلام نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ”نفسیات نبوت“ کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سر مو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔



زمین کو سبز بنی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ اگر کو سیرانی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ خوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟ آؤ انسان کو غور سے دیکھیں بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے؟

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا﴾ (المؤمنون: ۱۱۵)

”کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔“

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَن يُتْرَكَ سُدًى﴾ (القيامة: ۳۶)

”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟ انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحے سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فورا بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برے، نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لیے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت یہ کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا﴾ (البقرة: ۲۹)

”اسی نے تمہارے لیے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔“

پھر یہ بھی بتایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ﴾ (۲۲/ الحج: ۶۵)

”(اے انسان)! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے نگر رکھا ہے۔“

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْجِبُومَ مَسَاغِرًا يَا مَعْرِبُ﴾

(۱۶/ النحل: ۱۲)

”اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔“

ہستیاں دوہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے جمادات، نباتات کے، نباتات جمادات کے اور جمادات، نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیے، مخلوقات میں تو اب اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لا محالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لیے ہوئی ہے۔ الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلا واسطہ انسانوں کی بقاء، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۶)

”اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔“

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

① ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔  
② دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس و استقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

③ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بنتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لیے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات

سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گوارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے۔ ان کے افعال، حرکات اور آثار کو جبلت و فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مال کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال کو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطرار سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام عاقبتِ نبی، انجام اور مال کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات و نباتات تو اس لیے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لیے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلی و طبعی ہیں اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبک دوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیے ان سے عصیان نہیں سرزد ہوتا صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر و شران دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مال کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے اس لیے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لیے پیغامِ الہی کا محتاج قرار پایا ہے۔ جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکامِ الہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْحَبْلِ كَتْمٌ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ قُوَّتِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (النحل: ۴۹، ۵۰)

”اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، جانداروں

میں سے اور فرشتے، وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔“

اسی فطری اطاعت الہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۗ ثُمَّ كُلِّي مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۗ﴾ (النحل: ٦٨، ٦٩)

”اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں، اپنے لیے گھر بنا لے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل، مطیع ہو کر۔“

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْكَبِيرُ ضَمَّتْ طُكُلًا قَدَّ عَلَيْهِ صَلَاتُهُ وَتُسَبِّحُهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۗ﴾ (النور: ٤١)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے، اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔“

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح بیدار اور کار فرما ہے اسی طرح وہ ارادی قوت و اختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مقفود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مال اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لیے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ”تکلیف“ کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرر ارادہ مجبورانہ اطاعت الہی کے لیے نہیں بلکہ بارادہ اطاعت کے لیے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَكْبَنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۗ﴾ (الاحزاب: ٧٢)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور

اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔“

یہ امانت، اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجے کے طور پر شریعت الہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بارادہ اور با اختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیار افعال کی طرح احکام الہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیار افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح بارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بارادہ اطاعت کر کے حکم الہی کی تعمیل ضروری ہے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری بہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی بہام و وحی کی بارادہ پیروی کریں۔ لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و امر سے ہم کو واقفیت نہ ہو انبیاء اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّذِينَ آمَنُوا مِن بَيْنِ يَدَيْهِمْ وَأُولَئِكَ سَمِعُوا لِقَاءَ رَبِّهِمْ وَأُولَئِكَ لَهُمْ أَجْرٌ وَالَّذِينَ كَفَرُوا سَاءَ مَا يُحْكَمُ لَهُمْ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَرْضِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالذَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۗ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ﴾

(الحج: ۱۸)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا ہے۔“

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرانگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص بارادہ اور با عقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کردی گئیں ہیں مطیع اور سرکش! کائنات کے صحیفہ کا تدبیرگی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ بہادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں، سے جس صنف مخلوقات میں احساس ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایہ گیری کی خدمات انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لیے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی

آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جوتے، بے بوئے، بے پنے نکھارے، بن کپکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد، محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔ جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن تغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے، نباتات عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار و ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیاء اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذہب کی زبان میں ”دل“ ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک ارادی جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سر انجام پاتا ہے انبیاء علیہم السلام اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیے آتے ہیں۔ انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فی البہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو ہر پیشہ و اپنے متعلقہ کام کو بڑھا جاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاری گروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور

فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ارالہ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈ بن جائے۔

جو تمہارے لیے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے کپڑے بناتا ہے وہ جولاہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صنایعوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صنایع ہے اور جو تمہارے لیے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہاری مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لیے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں یہ عام علما ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیاء ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لیے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صنایع کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لیے ہیں ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے صد ہاتھم کے نغھے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال و افعال اور ہر قسم کی حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ”دل“ کیا انبیاء علیہم السلام اور اس کے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی تکمیل اور اصلاح

کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح، تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے کیا اس کی شان ربوبیت کے ساتھ سوائے ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقات کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے وہ ان سب کو جو تمہارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس اور حکومت اور اقلیم اور جغرافیائی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولاد آدم، اور کل بلند و پست طبقات کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کر دیتے ہیں ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت و محبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لیے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کے درمیان، امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلاف نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قومی اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب و ملل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ آئینٹلکس (فلسفہ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر جسم کی



صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بائیں ہمدان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔ اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفوں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور ان میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفہ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب و علل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا راہنما ہو جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے اور شر کے ختم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کر دے البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو اس کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان قوتوں کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجموعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب و علل کی تلاش و جستجو کی تشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاق سینہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے:

﴿يَا مَرْهُمُ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۗ﴾ (٧/ الاعراف: ١٥٧)

”وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیے حلال اور

خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔“

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِيَتَلَذَّ النَّاسُ عَلَى اللَّهِ حِجَّةً بَعْدَ الرُّسُلِ ۗ﴾

(۴/ النساء: ۱۶۵)

”ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں، تاکہ رسولوں کو اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے۔“ (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا)

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۗ﴾

(۵۷/ الحديد: ۲۵)

”ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں۔“

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیا اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائی و پاسیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت، جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔ وہ صرف اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں وہ خیال آراء شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے:

﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۗ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَئِمُّونَ ۗ وَاللَّهُمَّ يَقُولُونَ مَا لَا

يَفْعَلُونَ ۗ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۲۲۴-۲۲۶)

”اور شاعروں کے پیروکار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سمراتے پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔“

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے وہی ان کے قلب و روح کا سامان راحت بھی بہم پہنچاتا ہے ان کو اس لیے بھیجا ہے کہ

انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو کس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

﴿هُوَ الَّذِي يُعْزِلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخَوِّجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (٥٧ / الحديد: ٩)

”وہی خدا جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لیے کیا) کہ وہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔“

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لیے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور سخاوت ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیے نہیں، بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ استقر اور قیاس سے نہیں بلکہ عالم الاسرار کے مبدئ علم سے فیض پا کر۔ وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پرناشیر کلام کرتے ہیں مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں:

﴿وَالعَجْرُ إِذَا هَوَىٰ ۙ مَا حَصَلَ صَاحِبِكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَجْهُ يُؤْمِنُ ۗ عِلْمُهُ شِدِيدٌ ۗ الْغَوَىٰ ۗ ذُو مِرَّةٍ ۗ فَاسْتَوَىٰ ۗ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۗ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۗ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۗ أَفَتُهَوَّنُهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۗ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۗ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۗ﴾ (٥٣ / النجم: ١-٧-١٠-١٢-١٧-١٨)

”دو قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے، کہ تمہارا ساتھی (جینغبر) نہ بھولنا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا، طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درآئیں لیکہ وہ آسمان کے سب سے اوپر کناروں میں تھا۔ تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی، جو وحی کی نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کبھی کی اور

نہ سرکشی کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔“  
 ﴿قُلْ إِنَّمَا آتَيْتُمْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّي هَذَا بَصَائِرٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ  
 يُؤْمِنُونَ﴾ (۷/ الاعراف: ۲۰۳)

”کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے  
 وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لیے  
 جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔“

﴿وَأَنذَرْتَنِي لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ  
 الْمُنذِرِينَ﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿﴾ (۲۶/ الشعراء: ۱۹۲، ۱۹۵)

”یہ تو عالم کی پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے  
 تیرے دل پر اتارا، تاکہ فصیح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔“

تکلف: یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ، مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں کسی قوم  
 کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خود غرضی کے غیر مخلصانہ  
 اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن  
 سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جزو تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم و رواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن  
 پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن  
 انیما کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں  
 کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروغ اور اسی ایک جز کی  
 شاخیں جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی  
 ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور نیادای عظمت و جلال کا ہر منظر خادمانہ  
 اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت و طاقت  
 ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی  
 خوشنودی ہوتی ہے باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انیما ﷺ اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار  
 حیثیتوں سے نمایاں ہے مبدء اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ نبی  
 کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم کا

ماخذ منبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ استقر اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑی کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ﷺ اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں، تاکہ فتنہ و فساد رک جائے۔ فلاسفر اپنے دعوؤں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں وہ اگر کبھی قانون و حدود سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اولین نہیں۔ ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی چارواں گ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجموعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی اٹلنے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں لاسکے؟ وہ آبادیوں اور مجموعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیموں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے؟ وہ روجوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے؟

حکما اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق

نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکمانے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا، اچھائی کے بیج نے نشوونما پائی، ان کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور تو حید و خدا پرستی تو اس سے بدرجہا بلند ہے، جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا و اعظا، ہر موثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقفن، ہر کشور کشاف تاج اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

- ① سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالم غیب سے ہو، وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، علم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہمسفر و ہمنا ہو۔
- ② اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔
- ③ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

④ فضائل و اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

⑤ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز "آئسٹ" کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

⑥ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

⑦ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

⑧ اس کی دعوت و جدوجہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے، جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۃ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

﴿وَلِيكَ حُجَّتْنَا إِن يَرْؤِيهِمُ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۖ نَزَعُ مِنْ رَجْتِ مَنْ نَشَاءُ ۖ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝  
وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ  
وَسُلَيْمَانَ ۚ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ  
وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَاسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيُوسُفَ ۖ وَنُوحًا ۖ وَكُلًّا فَضَّلْنَا  
عَلَىٰ الْعَالَمِينَ ۝ وَمِنَ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَأَخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ  
مُّسْتَقِيمٍ ۚ ذَٰلِكَ هُدَىٰ اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ ۖ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا  
كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ  
وَكَلْنَا بَهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكُفْرِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ فُوهِدُهُمْ أَتَدْرَهُ ۚ قُلْ لَا  
أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝﴾ (٦/ الانعام: ٨٣-٩٠)

”اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب علیہ السلام بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور ایلیاس علیہم السلام کو ہر ایک نیکو کاروں میں سے اور اسماعیل اور اسمعیل اور یونس اور لوط علیہم السلام کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان

باتوں پر ایسے دوسروں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اے محمد ﷺ، تو بھی انہیں کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دلانا ہے۔“

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر، ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں:

① فرمایا: ”ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی“ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

② ارشاد ہوا کہ ”ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکو کار تھے“ اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے واغ ہوتے ہیں۔

③ یہ بھی کہا کہ ”ہم نے ان کو جن کر پسند کیا“ اور ”جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں“ جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

④ فرمایا کہ ”ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی“ اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

⑤ حکم ہوا کہ ”ان کی راہنمائی کی پیروی کر“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکو کار اور صالح بنتے ہیں۔

⑥ فرمایا کہ ”اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہل دنیا کے لیے نصیحت اور یاد دلانا ہے“ اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام ﷺ کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

① اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

② وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

③ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

④ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ ﷺ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

﴿يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾



(۲/ البقرة: ۱۲۹-۱۲۲/ الجمعة: ۲)

”وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سنا تا اور ان کو پاک و صاف بنا تا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔“

اس مختصری آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے جاہلوں کو آیات الہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔ ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ ۗ إِلَّا مَآ شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ ۗ وَيَبْتَئِرُكَ ۗ لِيُبَيِّنَ لِي ۗ فَاذْكُرَانِ نَفْعَ الْذِكْرِ ۗ سَيَذَكِّرُنَا لِمَنْ يَخْتَارُ ۗ وَيَجْعَلُهَا أَشْفَىٰ ۗ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ ۶-۱۱)

”ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے، پکارا اور چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہو گا وہ سمجھے گا اور جو بد بخت ہو گا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔“

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو ”بیخبر کی روحانی تعلیم ہے“ اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلانا اور اس کے لیے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے سہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے ”سمجھانے“ پر مامور کرنا اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تدکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرمانا کہ ”متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بد بخت محروم رہیں گے“ اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔ ❁

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ”خصوصیت“ کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں یہ مخصوص صفات

❁ یہ تفریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر ”تفسیر کبیر“، سورۃ الاعلیٰ، ج ۶، ص: ۵۲۸ اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں انہیں کوہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں پھل، پھول، چوپائے، پرندے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قند، بولنے کی طاقت، سمجھ و بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام دہی اور مال اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں میٹھاس، حنظل میں کڑوا پن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً و بدیعتاً ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قند و قاسم، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل اور اخلاق و عادات، وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دان، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سیکنگروں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ ادب و انشا کے خیالی بلند پرداز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے، ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صنایع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعر میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقت نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے ہینیال و نیولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور

ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفہ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلباڑی نہ مار سکا اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا، غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی، چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں:

وہی استعداد

ان میں سب سے پہلی چیز وہی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جو ہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدانے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے، کوئیل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدانے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ

”میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھے۔“ اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام ﷺ کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں، تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، اور حضرت عیسیٰ ﷺ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات قبل نبوت پر دھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نبوت پانے سے پہلے ہی آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہونے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاق علیہ السلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی ﴿يُغْلِبُوْهُ عَلَيْهِ﴾ (۱۵/حجر: ۵۳) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور شیلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لیے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاک دامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونوں سے تنہا مجاہدانہ آویزش، کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کا آغاز عمر میں علم و فہم، فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی اور پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراہ کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے دعائے ظلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ اور احوال ولادت و تربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت نبوت سے پہلے ہی تہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہان تاب کا مطلع انوار ہے۔

جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۹ میں (آدم بین الزوج والجد) کے الفاظ ہیں و مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۶۰۰ و مسند احمد، ج ۴، ص: ۱۲۷۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ حال ہے:

﴿فَبَشِّرْهُ بِبَعْلِ لَيْلَىٰ ۖ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ لَيْلَىٰ إِنَّ أَرَىٰ فِي السَّمَاءِ آيَةً أَذْهَبَكَ فَأَنْظِرْ مَاذَا تَرَىٰ ۖ قَالَ يَا كَيْتُ افْعَلْ مَا تُؤْمِرُ سَكُنْ فِي بَيْتِنَا رِجَالُ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝﴾

(۳۷/ الصَّفَّت: ۱۰۱، ۱۰۲)

”تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک برد بارڈ کے کی خوشخبری دی، تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا، تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں، کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں، اس نے جواب دیا اے میرے باپ! جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خطاب ہے:

﴿وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۖ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۖ﴾ (۲۰/ طہ: ۳۷، ۳۸)

”اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔“

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت یہ ارشاد ہے:

﴿لِيَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۗ وَابْتِنِ الْهَيْكَلِ صَبِيًّا ۗ وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۗ وَكَانَ تَقِيًّا ۗ

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۗ وَسَلَّمْ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ۗ﴾ (۱۹/ مريم: ۱۲-۱۵)

”اے یحییٰ! کتاب (توراة) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی۔ اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا نافرمان، سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔“

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿كَيْفَ نَكَلِمُهُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۗ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۗ آتَانِي الْكِتَابَ ۗ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۗ

﴿وَجَعَلَنِي مُبْرَأًا مِّنْ أَيْنَ مَا كُنْتُ مِن ۗ﴾ (۱۹/ مريم: ۲۹-۳۱)

”ہم کیسے اس سے بات کریں، جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔“

اور مکہ کا ”الامین“ نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝﴾ (۱۰/ یونس: ۱۶)

”تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔“

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر، اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں، بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں:

① وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف، وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

② فطرت: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علما کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ”جبلت“ کہتے ہیں حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھادیتا ہے؟

③ بدہست اولیہ: انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادی تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر جی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ، بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بدہستا معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی

چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں موجود نہیں بلکہ عالم غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

④ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں: باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، انہیں کا نام حواس خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر نکرتی ہیں اسی کا نام احساس ہے، ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے بیماری میں قوت ذائقہ بدل جاتی ہے اور اس نے بیٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو سکان اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

⑤ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں ان کی بنیاد درحقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرا کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقرا پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہوگئی ہو، طبیعات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کیے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو مابعد الطبیعہ اور فلسفہ الہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق

ہوسکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق و جستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لیے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات و فطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔ محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان و قطعیت ہوتی ہے، دو اور دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دو نا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہو سکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جن کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلمیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہے اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا: دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک



جاہلِ حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، باایں ہمدیہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔ عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر مادرائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات، آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا، یعنی فطریات کا علم، خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قوی کا عمل ہے تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے مادرائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی، دل و دماغ کے آئینہ پراپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قوی سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قوی سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔ فراست کے لفظی معنی ”تاڑ جانے“ کے ہیں تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف

بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم فن کے ماہروں کو اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اختیار اور نیکو کاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله)) ❁

”مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔“

② فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے یہ چیز بھی ایک کامل العقل اور صاحب الرائے انسانوں کو فطرۃ عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایان روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

③ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آ جاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کو سمجھنے کے لیے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق اتنا ہے کہ خواب، عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

④ الہام کے لفظی معنی ”دل میں ڈالنے“ کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور

ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علما، شعرا اور موجدین کے ذہن میں پردہ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

⑤ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دینے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیت، حیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے ذریعہ یقینی ہیں اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام ترمادی ہے یعنی وجدان پھر حسی ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمۃ الہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

① وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

② خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی منکمل نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

③ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ

يَاذِيْهِ مَا بَدَا لِيْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى حَكِيْمٍ ﴿٥١﴾ (الشورى: ٥١)

”اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا، پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند حکمت والا ہے۔“

مکالمہ الہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو نبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الہی کے مترادف بھی مستعمل ہوا ہے:

﴿وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُُّوْحَىٰ ۗ﴾ (النجم: ٤٣)

”نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔“

الغرض اسی امتیاز کے لیے علمی اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں، تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔ ❁

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص کو عام بندوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمائے۔

بہر حال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں ”وحی“ کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین

❁ ان اصطلاحات کی بحث کے لیے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التفسیر والتجیر لابن امیر الحاج المتوفی: ۸۷۹ ج ۳، ص: ۴۹۵ مطبوعہ امیر یہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیے۔

ذریعہ علم کا وہند لاساخا کہ ذہن میں آسکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریتوئلزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنسانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مخالفت نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مخالفت واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے:

﴿فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۰)

”تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیے ہے۔“

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۲۷/ النمل: ۶۵)

”کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔“

رسول کہتے ہیں:

﴿وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ (۶/ الانعام: ۵۰) ”اور میں غیب نہیں جانتا۔“

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بااين ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی

اطلاع دیتا ہے۔

سورہ جن میں ہے:

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِۦٓ اَحَدًاۗۙ اِلَّا مَنۢ ارٰتٰهُۙ مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (۷۲/ الجن: ۲۶، ۲۷)

”تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔“

دوسری جگہ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَّشَاءُ﴾

”اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو

چاہے چن لیتا ہے۔“ (۳/ آل عمران: ۱۷۹)

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتاً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (۲/ البقرة: ۲۵۵)

”اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔“

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، بائیں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورہ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً: قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوہ تبوک میں عدم شرکت کے، بعض عذر خواہ اصحاب کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی خدا نے فرمایا:

﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَّبِعِنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الَّذِينَ ظَنُّوا﴾

(۹/ التوبة: ۴۳)

”خدا نے تجھ سے درگزر کیا کیوں تو نے ان کو اجازت دی، تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔“

﴿لَقَدْ اِسْتَعَاذْنَا مِنَ الْفِتْنَةِ مِنْ قَبْلِ وَ قَلْبُوا لَكَ الْاُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ

كٰرِهُونَ﴾ (۹/ التوبة: ۴۸)

”انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے، یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔“

آگے چل کر ہے:

﴿مَرَدُّوْا عَلٰی الْبِغَاقِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ مَا تَحْنُ نَعْلَمُوْهُمْ ۝۱۰﴾ (۹/التوبة: ۱۰۱)

”یہ بِنِفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔“

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کُلّی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں ”رسول“ ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضہ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس، اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور وماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے وماغی کے سامنے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کوبار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے (۶/انعام: ۳، ۷، ۱۳، الرعد: ۹، ۵۹/الحشر: ۲۲، ۶۳، التائبین: ۱۸) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے:

① ”زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کونہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے، کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لیے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو نبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔“

حضرت نوح علیہ السلام کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۝﴾

(۱۱/ہود: ۴۹)

”یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے، ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف، تو، تو ان کو پہلے سے

جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔“

حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ يَقِفُونَ﴾

﴿مَرِيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ (۳/ آل عمران: ۴۴)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس

موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان

کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔“

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی

نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا اب اس کا علم جس

غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ

يَمْكُرُونَ﴾ (۱۲/ یوسف: ۱۰۲)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے

پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔“

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ

ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

② اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و

قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک

موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانہوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

﴿فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانظُرُوا إِلَىٰ مَعْلَمِ مِنَ الْمُنْتَضِرِينَ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۰)

”تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیے ہے، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے

والوں میں ہوں۔“

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر

خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے:



﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۳۱/ لقمان: ۳۴)

”خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔“

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي﴾

(۷/ الاعراف: ۱۸۷)

”وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔“

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

﴿وَمَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا مَّا ذَا لِكَلْبِ غَدَاةٍ وَمَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا يَأْتِي أَرْضٍ تَمُوتُ﴾

(۳۱/ لقمان: ۳۴)

”کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔“

③ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گویا ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیے کسی نہ کسی مسافت، عدمِ حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لیے زمانہ حال کے علم کے لیے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔ حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۱/ لقمان: ۳۴)

”اور اللہ جانتا ہے زمینوں کے اندر جو ہے۔“

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لیے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

﴿وَلَيْلٌ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۱/ ہود: ۱۲۳)

”اور خدا ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۸)

”بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

④ عالمِ غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ

علم سے قطعاً باہر ہیں ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آ سکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

﴿الَّذِينَ يَخْتَفُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۴۹)

”جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔“

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (۲/ البقرہ: ۳)

”وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔“

﴿الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ﴾ (۱۹/ مریم: ۶۱)

”وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔“

”غیب میں“ کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، جو اس سے علم حاصل کیے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطے سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بقتصر مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان مناظر و احوال کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا انکشاف، پس پردہ رویت، دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ معنیات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رویت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لیے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکہ نبوت

کلمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ”ملکہ نبوت“ کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قوی

حافظ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قوی ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قوی پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں ان قوی کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قوی ہیں، جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیاء میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکہ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قوی مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکہ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، ہدایتِ اولیہ، احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائل کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے شرع کی زبان میں اسی کو وحی و الہام کہتے ہیں علم کلام کی اصطلاح میں ملکہ نبوت اور عام مجاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

امحانِ نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کر دی جاتی ہے اسی طرح انبیاء میں فشتائے الہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ فطرتاً ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے فشتائے الہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

ع یار ما ایس دارد و آن نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بدو فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا

ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں اسی کا نام ”ملکہ نبوت“ ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام ”وحی“ ہے۔

آج کل قرآن مجہبی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہیں دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے جیسے قرآنی وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہی قوت علم و فہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشا ”ملکہ نبوت“ کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لیے پیغمبر کی وحی اور ملکہ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الہی، صحیفہ ربانی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکہ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسری فردی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے۔ کتاب براہ راست وحی الہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکہ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی

جاتی اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف اور حرف اور لفظ اور لفظ ﴿وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لیے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لیے کتاب کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قراءت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قراءت کیے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الہی کہا جاسکتا ہے مگر معنای اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی توازن کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں بنا بریں چونکہ سنت، وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لیے وہ غیر متلو ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کاسے کی بعینہ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لیے صحابہ کے دریافت پر، یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی یا انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا اور اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہ انہیں الفاظ کو بے کم و بیش

دہرا دیتے تو یہ بریکار ہوتا کہ انہیں الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لیے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔ درحقیقت احادیث میں قانون الہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشاء الہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لیے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً و جہی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً و جہی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور مملکت نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج میں اسی لیے ان کو اصطلاح میں ”وحی غیر متلو“ کہتے ہیں۔ ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے ﴿یہ وحی الہی کا حقیقی منشا ہے﴾ آنحضرت ﷺ نے اس منشاء الہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا: ”ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔“ ﴿کبھی ارشاد ہوا: ”رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔“﴾ ﴿ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا: ”تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں۔“﴾ ﴿ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے صحابہ رضی اللہ عنہم حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ”وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا۔“ حاضرین نے عرض کی، یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا: ”وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزار کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔“﴾ ﴿ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا: ”وقت پر نماز ادا کرنا۔“ دریافت کیا اس کے بعد فرمایا: ”ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔“﴾ ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں:

﴿وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقْوَاهُ ۖ وَالْوَالِدِينَ إِحْسَانًا﴾ (البقرة: ۸۳- ۴ / النساء: ۳۶)

”ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔“

﴿فَلَا تَقُلْ لِهَآءِ آتِي﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۲۳)

”وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اوف نہ کہو۔“

- ۱۶- ۴۶ / الاحقاف: ۱۶- ﴿سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة: ۳۱۰۶۔  
 ۱۷- جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین: ۱۸۹۹۔  
 ۱۸- مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین: ۶۵۰۰۔ ﴿مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم انف من ادرك ابويه... الخ: ۶۵۱۰، ۶۵۱۱۔ ﴿بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلة: ۵۹۷۰۔

﴿وَلْتَجَاوَزْ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ١٦)

”یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔“  
یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے۔ ❁

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کل احکام کے تحت میں مندرج ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کوشبہ ہو سکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرمادیے ہیں جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہل علم کے لیے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمادیا ہے اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راہنما فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام واجتہاد و حکمت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں۔ تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں: ❁

① اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الہی کو دریافت کر لے)

❁ مجھے پہلے یہی شہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بعد اللہ کہ تلاش و تھنص سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ، ص: ۲۸-۲۹-۶۲ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شافعی اندکس التوفی ۹۰ء کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام، ج ۱، ص: ۱۷۵، ۲۲۱ مطبعة سلفية مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ الباقی میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

❁ کتاب الرسالہ امام شافعی، ص: ۳۸۔

- ② رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)
- ③ تمام احادیث نبوی القافی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔
- ④ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الہی سے جداگانہ، مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین آراء میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القافی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوت فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوت فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القا سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الہی کہو بات ایک ہی ہوتی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفہ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور ان کے جزئیات کتاب الہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما، ملکہ نبوت اور اہل شرع، حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

### اجتہاد نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہاء کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہاء کے طریقہ پر اجتہاد نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علم سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، بہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ



مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں اس لیے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جو مصلحت الہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرمادیتا ہے (اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے، یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا پہلو اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔ ❁

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنایاً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیے اس اجتہاد نبوی کے معنی البہام، حکمت، ملکہ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس بحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

❁ مطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے حوالہ کے لیے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمیٰ بہ التقریر والتحییر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳، ص: ۲۹۴، ۲۹۹، مطبعہ امیرہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح و التوضیح فی حل غوامض التنقیح، ج ۲، ص: ۴۵۲ مطبعہ مکتبہ صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

ساتواں بحث: احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علومِ نبوی ﷺ کے اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

① ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغِ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (٥٩/ الحشر: ٧)

”پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔“

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علومِ معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزا و سزا اور عجائبِ المملکت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا تو ان میں شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کروایا تھا وہ مقاصد، جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا ان کی تشریح فرمادیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً: اخلاقِ صالحہ اور اخلاقِ غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کروایا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان تو ان میں کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

② دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔“ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ”میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کر دوں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔“ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ ”تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔“ اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا، عبادت نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً: ام زرع اور خرافہ کے قصے وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ ”میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟“

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً: فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے کہ ”اب ہم کوچ میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا“ بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہو اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً: آپ کا یہ ارشاد کہ ”جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے۔“ نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ”واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا۔“ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ ❁

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الہی سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں:

① کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے آکر کرسی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوانے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

② وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً: جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

③ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً: وضع ولباس، فرش پر نشست، کبیل اوڑھنا، دسترخوان، چچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

④ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تلقین طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً: ام زرع اور اس کی نوسہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

⑤ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

⑥ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی راکیں، مثلاً: مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نرچھو ہاروں کے پھول مادہ چھو ہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رکمی بات سمجھ کر فرمایا کہ ”اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو۔“ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی لوگوں نے آ کر عرض کی، فرمایا: ”میں نے ایسا خیال کیا تھا، ((انتم اعلم بما مور دنیا کم)) کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔“ یہ امور تغیر اور رد و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً: عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں ایک براہ راست، وحی الہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی۔ یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:

① یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص

✽ مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال مقالہ شرعاً: ۶۱۲۶ تا ۶۱۲۸؛ ابن ماجہ، ابواب الرہون،

باب تلقیح النخل: ۲۴۷۰، ۲۴۷۱؛ مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص: ۱۵۲۔

نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ عطا فرمایا ہے اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلمہ کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرمادیا کرتے تھے۔

② پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اس لئے ”ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔“

”پیغمبرانہ اجتہاد“ کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکہ نبوت، الہام، القا، حکمت ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور ”اجتہاد نبوی“ میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے اسی لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا چنانچہ توراہ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی ﷺ کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض تشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ نے، تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بے گناہی

نبی ﷺ کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے یہود میں چونکہ پیشین گوہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخلیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام ﷺ کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح علیہ السلام کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان

عظیموں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و صلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پرتا شیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:

﴿ إِنَّهُ لَيُنسُّ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۗ إِنَّهَا سُلْطٰنَةٌ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ۗ ﴾ (النحل: ۹۹، ۱۰۰)

”شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر، جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔“

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

﴿ وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَلٰلٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ يُحْسِنُونَ ۗ ﴾ (النحل: ۱۲۷، ۱۲۸)

”اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو، بے شک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکو کار ہیں۔“

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکو کار ہوتے ہیں۔ سورہ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَتَوَكَّلُ الشَّيْطٰنُ ۗ تَتَوَكَّلُ عَلَىٰ كُلِّ آفٰكٍ أَثِمٍ ۗ لِيَْلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْتُرَهُمْ كُذْبًا بُونًا ۗ ﴾ (الشعراء: ۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اتارتے ہیں، ان پر اترتے ہیں، جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گناہگار ہوتے ہیں (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں) کان میں ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

سورہ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ أَقَالٍ آمِيهِ ۖ يَسْمَعُ آيَاتَ اللَّهِ تُنزلُ عَلَيْهِ ثُمَّ يَصِرُ مُسْتَكْبِرًا ۚ كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِيرَةٌ لِّعَذَابِ النَّوْمِ ۗ﴾ (٤٥ / المجانية: ٨٠، ٧)

”پھنکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گناہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے گویا کہ اس نے سنا نہیں، تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔“

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گناہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گناہگاری کے صریح منافی ہے۔  
ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (٣ / آل عمران: ٧٩)

”اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے، یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔“  
یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔  
اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغْلِبَ وَمَنْ يَغْلِبْ يَأْتِ بِآيَاتٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۗ أَفَمَنْ أَتَاكَ رِضْوَانُ اللَّهِ لَمَّا بَاءَ بِسَخِطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۗ وَيُسَّ الصَّيْرُ ۗ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۗ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۗ﴾ (٣ / آل عمران: ١٦١-١٦٤)

”کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں، کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپالے اور جو کوئی چھپالے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے، وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے، جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک ایسے

رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ بے شک اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

ان آیتوں میں گوہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی حَقْلٰی کھاتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضا مندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گناہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیاء ﷺ کے لئے بار بار قرآن نے ”چن کر پسند کرنا“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنْ النَّاسِ ط ﴾ (الحج: ۷۵)

”خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں سے۔“

☆ چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَاٰنُوْحًا وَاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۳۳)

”اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔“

☆ خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿ وَاذْكُرْ اِصْطَفٰىنَا فِي الدُّنْيَا ﴾ (البقرہ: ۱۳۰)

”ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔“

☆ حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنِّيْ اصْطَفَيْتَكَ عَلٰى النَّاسِ يٰمُوسٰى وَاِيْكُلُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۴۴)

”میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔“

☆ ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکو کار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

﴿ وَاذْكُرْ عَبْدًا نَّابِئًا اَبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولٰٓئِذِيْ وَاَلْبَصٰرِ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرٰى الدّٰرِ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفٰىنَ الْاَخْيَارِ ﴾

(۳۸/ ص: ۴۵-۴۷)



”ہمارے خاص بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔“

سورۃ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿وَكَلَّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۝ وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُهَدُّونَ يَا مَعْرُوفًا وَآوَحِينَآ إِلَيْهِمْ فَعَلَّ الْخَيْرَاتِ  
وَإِقَامَ الصَّلَاةَ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةَ وَكَانُوا لَنَا عِمْدِينَ ۝﴾ (۲۱ / الانبیاء: ۷۲، ۷۳)

”ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔“

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۃ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

﴿كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝﴾ (۶ / الانعام: ۸۵) ”یہ سب صالحوں میں تھے۔“

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَيَّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (۶ / الانعام: ۸۶)

”ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔“

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا:

﴿وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾ (۶ / الانعام: ۸۷)

”اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔“

صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گناہگار و نیکو کار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس و اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۗ

سَوَاءٌ نَحْيَاهُمْ وَمَمَّا نُهُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝﴾ (۴۵ / الجاثیة: ۲۱)

”کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے

اور اچھے کام کیے بنائیں گے، ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔“

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے وصف میں فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَبْتَغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَهَا حَسْرَةً وَإِلَّا اللَّهُ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۹)

”جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔“

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے، وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں ہے:

﴿يُنْسَاءُ النَّبِيِّ لَسْتُمْ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۲)

”اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کوئی ایک نہیں ہو، اگر تم متقی ہو۔“

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادہ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۳)

”اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے، اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔“

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لیے گناہ اور بدی کی نجاست مٹل ہے تو خود انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر ہے۔ ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الْحَيْثُ لِيَخْبِتِينَ وَالْحَيْثُ لِيَخْبِتِينَ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾

أُولَئِكَ مَبْرُؤُونَ وَمَا يَقُولُونَ ط (۲۴/ النور: ۲۶)

”گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے، گندیوں کے لئے اور ستھریاں، ستھروں کے واسطے، اور ستھرے، ستھریوں کے واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔“

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے

پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی سحرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء و حقیقت مقتدی اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲۱)

”تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔“

نیز ان کی اطاعت واجب ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۴/ النساء: ۶۴)

”ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے:

﴿إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (۳/ آل عمران: ۳۱)

”اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔“

کیا کسی گناہگار اور عرصیاں کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گناہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکو کاری پھیلی ہے؟ برائی اور گناہگاروں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خودتو شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۶۵)

”یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف

سے سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔“

کیا انبیائے کرام ﷺ سے بڑھ کر کوئی بندہ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عرصیاں کاری، دوسرے شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور

فرمایا کہ میری رحمت اور مہربانی تجھ پر مہذبول ہے، وہ ہر وقت تیری دیکھ رہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ ۗ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا

أَنفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ ۗ وَأَنْزَلْنَا اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

تَعْلَمُ ۗ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۱۳)

”اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔“

اور یقیناً مہموم و کل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔ خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں اور خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنا نہیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحت الہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو بر جا رکھتا ہے، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

(۲۲/ الحج: ۵۲)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے، تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا انا اور حکمت والا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾ (۲/ النجم: ۵۳)

”(اے مسلمانو!) تمہارا، صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔“

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہد سابق اور زمانہ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شہد کا شفافی بخش جواب دے

ویا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان فصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں، خفاجی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں مثلاً دوست محمد کابللی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفة الاخلاء فی عصمة الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بنی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے مختصر اصولی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کرو دینا ہے۔

① سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ و عصیاء کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والا کرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمانبروار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے تصور کا مقرف، اپنی تقصیر کا مقرر، اپنی کوتاہیوں پر مجرم اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِي اٰطَعُ اَنْ يُغْفِرَ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾ (الشعراء: ۸۲)

”اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔“

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچتے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ اس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

﴿اِذَا جَاءَكَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَاَنْتَ النَّاسُ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَوْ جَاۗءَكَ فَسِتْرُ يَمْهَدِيْ

رَبِّكَ ۖ وَاسْتَغْفِرْ لِحَاۗتِكَ ۗ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾ (النصر: ۱ تا ۳)

”جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ و رگروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرو اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع کرنے والا ہے۔“

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی تیغ کئی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورہ فتح میں فرمایا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَظِيمًا﴾

(۴۸/ الفتح: ۱-۳)

”ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی، تاکہ اللہ تیری اگلی بچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔“

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گناہ گاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کا ملکہ کا اظہار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرْهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا﴾ (۴/ النساء: ۱۷۲)

”مسح علیہ السلام کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا، کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔“

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گناہ گاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کا ملکہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گناہ گاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبول تام کی بشارت ہے۔ سورہ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرہ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جاں فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ

تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضا مندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ غلو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتبِ جلیلہ عنایت کرے۔ عبدیتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار ان کو ”اے نیک استاذ!“ کہہ کر خطاب کرتا ہے اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

”تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں؟ مگر ایک یعنی خدا۔“ (لوقا ۱۸، ۱۹)

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

”اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنا دین ہم کو بخش دے۔“ (متی ۱۲، ۶)

ان کی گناہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً: ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے، یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو، یا قصد اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکیوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)۔

ع جن کے رتبے ہیں سو ان کو سوا مشکل بھی ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ”ذنب“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں، ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کو شامل ہے ❀ اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگزاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں

❀ اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے اس کی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس وادیب الاب ہنریکس لائسنس کی کتاب فرانسہ اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم الذنب الذی يستحق العقوبة عليه ولا يصح ان يوصف به المجرم، وبين الاثم والذنب فرق من حيث ان الذنب مطلق الجرم عمدًا كان او سهواً بخلاف الاثم فانه ما يستحق فاعله العقاب، فيختص بما يكون عمدًا، والحنث ابلغ من الذنب، لان الذنب يطلق على الصغيرة، والحنث على الكبيرة والجرم لا يطلق الا على الذنب الغليظ، (ص: ۹۶، ۹۷) مطبوعہ کائنات لیبک، ۱۸۸۹ء۔

قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے اس بنا پر اگر ان سے احیانا کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنادی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے:

﴿ فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَةً فَتَبَّ عَلَيْهِ ط ﴾ (البقرة: ۳۷)

”تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَبَّ عَلَيْهِ ط ﴾ (طہ: ۱۲۲)

”پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿ لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ ط ﴾ (التوبة: ۱۱۷)

”یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْعَذَابِ ط ﴾ (الانبیاء: ۸۸)

”پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔“

﴿ لِيَعْفَرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ط ﴾ (الفتح: ۲)

”تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی سب فروگزاشت معاف کرے۔“

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

② انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جبل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو، علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جبل اور ہدایت کے بلند سے بلند مرتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت ورخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام و دہن میں شہد پکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح



نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۖ وَوَجَدَكَ عَابِلًا فَأَغْنَىٰ ۗ ﴾

(۹۳ / الضحیٰ: ۶-۸)

”کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا، تو راہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا، تو بے نیاز کیا۔“

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

”ضلالت“ کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بھینکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

﴿ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اِلْحُدُّهُمَا فَتَنَّا كِدًا اِحْدٰهُمَا الْاٰخِرٰى ۗ ﴾ (البقرة: ۲۸۲)

”کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔“

ایک اور آیت میں علم الہی کی تعریف میں ہے:

﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَلْتَمِسُنِيْ ۗ ﴾ (طہ: ۵۲)

”نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔“

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ”ضلال“ کے معنی عربی میں اور محاورہ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الہی کا نور اس کے سامنے نہیں چکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبلی کو گھونسا مارا تھا، جس کے صدمہ سے وہ اتفاقاً مر گیا تھا، نبوت پا کر جب لوٹے تو فرعون نے ان کو وطن دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿فَعَلَّهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ الصَّاكِينِ ۝﴾ (الشعراء: ۲۰)

”میں نے اس حالت میں کیا تھا، کہ میں چونے والوں میں سے تھا۔“

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی نہ بت کو پوجا تھا نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقاً کسی کمزور کار جانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں ”ضلالت“ کہا گیا ہے دوسری جگہ اس کو ”غفلت“ (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

﴿مَنْ نَقَضَ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ

قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ۝﴾ (۱۲/ یوسف: ۳)

”ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگر چہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔“

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے:

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِمَّنْ آمَرْنَا مَّا كُنْتُ تَذَرِي مَّا الْكُتُبُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ

جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾

(۴۳/ الشوری: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے راہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔“

”کتاب و ایمان“ کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے، اس سے مقصود حقیقی گناہگار، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی راہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے

یہ ہدایت کا دور ہے چنانچہ ایک موقع پر انبیاء علیہم السلام کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَكَ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ طَٰغُوتًا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ﴾ (۶/ الانعام: ۸۴)

”اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب علیہم السلام بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔“

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ”ضلالت“ ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔ اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں ضلالت سے مقصود گناہ گاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

### نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ بد اخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے، تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے ”نجات و ہندہ“ کو انسانیت سے پاک، خود خدا، یا خدا کا جزو یا ناسوت والا ہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے راہنماؤں کو دیوتا اور اتار یعنی تجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و در ماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بناتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مانوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباؤ ہوتے، تو فرشتہ کو ان کے پاس

رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دُورخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاک دائمی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر مافوق البشر ہوتے ہیں یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبران کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿ اُبْعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۴)

”کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔“

وہ بشریت کو رسالت کے معنای سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۳)

”میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔“

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی انسان ہی رہنمائی کر سکتا ہے:

﴿ اَبَشَرٌ يَهْدُونََنَا ﴾ (۶۴/ التغابن: ۶)

”کیا انسان ہماری راہنمائی کریں گے۔“

یہ وہی شبہ تھا، جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موردی گناہ گار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دلا سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موردی گناہ گار نہیں بلکہ وہ گناہ گار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی، اور انبیاء علیہم السلام کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

﴿ اِنَّ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۱۰)

”تم تو نہیں ہو، لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔“

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

﴿ هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۳) ”نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔“

﴿ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۲۴)

”نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔“

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے:

﴿ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۱۵۴) ”تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔“

﴿ مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۳۶/ نساء: ۱۵) ”تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔“

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے:

﴿ مَا تَزِدُكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ﴾ (۱۱/ ہود: ۲۷) ”ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔“

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے۔ فرمایا:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَنْزِلُ عَلَيْنَا مِنْ عِبَادِهِ ﴾

(۱۴/ ابراہیم: ۱۱)

”ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں، لیکن خدا اپنے بندوں میں

سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔“

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیاء علیہم السلام نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ ”کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں۔“ اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیاء علیہم السلام کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں گویا اس کا نشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں مصعب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر فرقہ نے یہ

دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جزو ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدہ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرادیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورہ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

﴿ اَلْحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُواْ اَنْ یَّخْتَدُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِ اَوْلِیَآءِ اِنَّا اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِیْنَ نُوْرًا ۝﴾ (۱۸/ الکہف: ۱۰۲)

”کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔“

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوحٰی اِلَیَّ اَنْ اَنِیَّ اِلَہُكُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۝﴾ (۱۸/ الکہف: ۱۱۰)

”کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔“

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہ سورہ حم السجدہ (فصلت) میں ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوحٰی اِلَیَّ اَنْ اَنِیَّ اِلَہُكُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاَسْتَفِیْمُوْا اِلَیَّ وَاسْتَغْفِرُوْا لَّی وَّیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ ۝﴾ (۴۱/ حم السجدہ: ۶)

”کہہ دے کہ میں تو تمہاری ہی طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے، کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔“

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا

کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیے یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو:

﴿وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَنْزِلَ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً ۖ أَوْ تُنَادِيَ بِالنَّجْمِ ۖ أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْحَبِيبِ قَبِيلًا ۚ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُرُوفٍ أَوْ تَرْفَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِذِي قَبْطِكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرُؤُهُ ۗ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

”اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔“

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں:

﴿قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ الْاَبَشْرًا ۗ سُوْلًا ۗ وَمَا مَنَعَكَ النَّاسَ اَنْ يُؤْمِنُوْا اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشْرًا ۗ سُوْلًا ۗ قُلْ لَوْ كُنَّا فِي الْاَرْضِ مَلَائِكَةً يَّمشُوْنَ مَطْبِئِيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا ۗ سُوْلًا ۗ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۳-۹۵)

”کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی، ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان

پراتا رہتے۔“

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا۔  
کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

﴿ هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝ ﴾ (۲۱ / الانبیاء: ۳)

”یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔“

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے معنائی ہی معلوم ہوئی، انہیں کہا گیا کہ نبوت رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں، جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہودان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے ہیں:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(۲۱ / الانبیاء: ۷)

”اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو، جن کو ہم وحی کرتے تھے جاننے والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے۔“

یہی جواب سورہ یوسف میں دیا گیا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ط ﴾

(۱۲ / یوسف: ۱۰۹)

”اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔“

اس سے زیادہ تفصیل سورہ نحل میں ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ ۝ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ ﴾

(۱۶ / النحل: ۴۳، ۴۴)

”اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری، تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور، تاکہ وہ سوچیں۔“



ہر شخص جو مشیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مشیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانی اور جسمانی قوی اور مخلوقیت سے ہے ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان رہ کر بھی، غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جاہل کے علاوہ علم و جاہل کے علاوہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جاہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جاہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لوتو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قوی میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیر و رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور بائیں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام ﷺ کی بھی ہے وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں: ((أَيُّكُمْ مِنِّي؟ أَيُّتُ يَطْعَمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي)) ﴿﴾ ”تم میں کون میری مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور

روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟ اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔“ (وَكَيْفَ لَكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ عَلَيْهِمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ) ﴿۱﴾ اور اسی طرح انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ”میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔“ ﴿۲﴾ کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿أَفَتَعْبُدُونَ عَلَىٰ مِثَالِ مَا يُؤْتَىٰ ۖ﴾ ﴿۵۳﴾ (النجم: ۱۲) ”کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو۔“ ﴿وَلَقَدْ رَاَهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾ ﴿۸۱﴾ (التكوير: ۲۳) ”اور اس نے فرشتہ کو آسمانوں کے کناروں میں دیکھا۔“ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المؤمنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضایہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المؤمنین کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿يُيَسِّرُ الْقَلْبَ لِمَنْ تَشَاءُ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ ۗ إِنَّ انْقِيبَاتِ﴾ ﴿۳۳﴾ (الاحزاب: ۳۲) ”اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔“ تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلندتر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہاد نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فرد و گزاشتوں پر تشبیہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدا نے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تشبیہ نہ ہوئی تھی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشاء الہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا

صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قوله: وکلّم اللہ موسیٰ تکلیما: ۷۵۱۷۔

صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب عظة الامام الناس فی اتمام الصلوٰۃ: ۴۱۸۔

تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اس سے بدامنا ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی ﷺ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لحوں کا قرار بھی ممکن نہیں اور لغزش ہوئی اور ادھر علم الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا ان پر عمل کیا اور وحی الہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشاء الہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات میں سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین و شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

### اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرائے تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علت مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقرائے تمثیل کے منطقی و اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نور رسالت، فہم نبوت، حکم ربانی اور شرح صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے جن میں یہ بیج کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر القباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر ہے، آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے آپ نے جو پہلا اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بد اخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ وہ بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہتر کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گویا ہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الہی نے تنبیہ کی ہے:

### پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الہی

جن اجتہادی امور پر وحی الہی نے تنبیہ کی ہے ان میں:

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بھجار رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بد حال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبداللہ بن ام مکتوم کا آجانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و مواعظت کی طرف سر تاپا متوجہ رہے، اس پر وحی الہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمَىٰ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَوَدُّ ۙ اَوْ يَدَّبَّرَكَ ۙ فَتَنْفَعَهُ الْوَدَّ كَرِي ۙ اٰمَّا مَنْ اَسْتَعْلَىٰ ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدَّىٰ ۙ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَلِي ۙ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۙ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلْعَىٰ ۙ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۙ﴾ (۸۰ / عبس: ۱-۱۱)

”تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنوڑتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھنا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنوڑنے کا تجھ پر کوئی

الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (وہ خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تعامل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔“

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تشبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں اس کی نگاہ میں بیٹا اور ناپینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے، ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الہی نے تشبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ دوسرے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ: سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ بنی نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت رد عمل اپنانا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پچھلا جو ہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا

اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقی انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوہ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سا لہا سال سے کسب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغ دار تھے وہ دفعۃً مغلوب ہو گئے، ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر ستر صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے راہنما کی قوت راہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مال غنیمت، زرفدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہو گیا آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے زرفدیہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجویز کو فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ 'اے ابو بکر! تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی ہے' آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرفدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جوان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان جاری کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے لیکن وحی الہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعۃً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے بڑے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہم کو ملنا چاہیے' یہی اختلاف زرفدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا جیسا کہ سورہ انفال

• مستدرک حاکم، کتاب المغازی، ج ۳، ص: ۲۱۔

• سیرت ابن ہشام، ذکر النبیء بدر والاسازی، ج ۱، ص: ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی مصر۔

کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ۗ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ۚ فَأَتَقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝﴾ (۸/ الانفال: ۱)

” (اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔“

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ سورہ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:

فينا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا في النفل وساءت فيه اخلاقنا فترعه الله من ايدينا فجعله الى رسول الله ﷺ فقسمه رسول الله ﷺ بين المسلمين عن سواء۔ ❁

”یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا، تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرمایا۔“

یہی وہ تشبیہ ہے جو وحی الہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ ❁ پر کی اور آیت اتری:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُفْخَرَ فِي الْأَرْضِ ۗ نَكْرَهُنَّ عَرَضَ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ فَكُلُوا مِنَّمَا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

(۸/ الانفال: ۶۷، ۶۹)

”کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تاکہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی، تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا، حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحیم کرنے والا ہے۔“

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زبرد یہ وصول ہو، یا وصول کیا جا رہا تھا، اس کے بعد یہ تسلی دی گئی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي آيِدِيكُمْ مِّنَ الْأَسْرَىٰ ۖ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا آخَذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرَ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ (۸/ الانفال: ۷۰)

❁ سیرت ابن ہشام ذکر الفی بدر والاساری، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

❁ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

”اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا، تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا، جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے لئے زرفدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی \* حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرفدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں، تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خنزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرفدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سزائش اور مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔ بہر حال دہی مال غنیمت اور زرفدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمایا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتہاد نبوی کے مطابق مناسب، موقع پر جائز و حلال و طیب ہی ٹھہرایا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق ﴿كُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ﴾ کا حکم اسی وقت آ گیا، اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿فِيمَا مَنَّا بَعْدَ وَاَمَّا فِدَاءٌ﴾ الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بد اخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیے گئے۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوہ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کے دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہو گئی مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصور وار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی:

﴿وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ انْفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ عَفَا اللَّهُ عَنْكَ اِلَيْهِ اُذِنْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَّبِعَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ﴾ (۹/التوبة: ۴۲، ۴۳)

”وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی،

\* مزید تفصیل کے لیے دیکھو اس سیرت النبی ﷺ جلد اول میں غزوہ بدر کا بیان۔



جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور توجان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔“  
ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا بہر حال یہاں بھی منٹائے خطا، اگر خطا سمجھی جائے، تو وہی ترحم کی شان تھی۔  
چوتھا واقعہ: منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿ اِسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ۗ ﴾ (۹/ التوبة: ۸۰)

”تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے، یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔“

اس حکم کے آنے کے بعد عبد اللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آ کر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ فرط کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض بھی کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے فرمایا: ”میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔“ ﴿ ۱۰ ﴾ بہر حال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بے کار دے سود بتایا گیا تھا مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا، تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ گو ایک مسلمان کی دلجوئی تو ہوگی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لئے حکم ہوا:

﴿ وَلَا تَصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّا تَأْتِيكَ بِهِ وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۗ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ۗ وَمَا تُوَاوٰهُمْ فَسِيقُوْنَ ۗ ﴾ (۹/ التوبة: ۸۴)

”اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ ان کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گناہ گاری کی حالت میں مرے۔“

پانچواں واقعہ: اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح، چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال

کرنے کا عہد فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضا مندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کر لے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو نا پسند ضرور ہی کرتے اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الہی میں تبدیل و تحریف کا مترادف ہو جاتا اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبروں کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروا نہ چاہیے۔ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(۶۶/التحریم: ۱)

”اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے، اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں اور اسی لئے وحی الہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے راہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحت پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحت پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الہی نے پروا نہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الہی و شریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و ہدایت کی معرفت سے کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ اُلٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو استغفر اللہ ثم استغفر اللہ اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمتِ الہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور راہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد اور اے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الہی، القائے ربانی، حکمتِ یزدانی، فہمِ رسالت، ملکہِ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت، عمر فاروق برسرِ منبر یہ فرماتے ہیں:

يا ايها الناس! ان الراى انما كان من رسول الله ﷺ مصيبا لان الله كان

يريه وانما هو منا الظن والتكلف۔ ❁

”اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔“

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلامِ پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَا لِيْلِكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرْسَلَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِلْغٰلِبِيْنَ

خَصِيْمًا ۝ ﴿ ٤ / النّساء: ١٠٥ ﴾

”ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے

فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دو غابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سوجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اتما افضى بينكم برأى فيما لم ينزل على فيه)) ❁

”میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی، اپنی رائے سے

فیصلہ کرتا ہوں۔“

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الہی دست گیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گزشتہ پانچوں

واقعات سے ظاہر ہے۔

www.KitaboSunnat.com

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ”ارابتِ الہی“ ہوتی تھی

❁ ابوداؤد، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸۶۔

❁ ابوداؤد، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸۵۔

یعنی خدا کی طرف سے آپ کو روائے سوچھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اراستِ الہی (خدا کی طرف سے بھجایا جانا) تاکہ آپ کتابِ الہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

”میں ایک بشر ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے بھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق و لادوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“ ❁

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم و انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنی نہیں قرار پاسکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح و صواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے اور اس ”اراستِ الہی“ کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمایا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں (فَسْتَأْنِبُ بَيْنَهُمَا)۔

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے یہ سمجھے کہ گو

حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن اب جب عدالت نبوی ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصہ حق کے گناہ سے بریت ہو گئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عند اللہ جو برسر حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو برسر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں روپڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ ❁

آنحضرت ﷺ رو داد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا اسی لئے ارشاد ہوا کہ

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَكَّرْتُمْ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (٤/ النساء: ٦٥)

”سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔“

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (٣٣/ الاحزاب: ٣٦)

”اور کسی ایماندار، مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے، تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے بے حکم چلا، وہ صریح گمراہ ہوا۔“

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکید کی حکم برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا:

﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ۗ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۗ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمْ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحْيِفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ أُمَّ يَكُلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۗ﴾ (٢٤/ النور: ٤٨-٥٠)

”اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ رسول، ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو، تو قبول کر کے

چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ نا انصافی کرے گا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔“

### عقل بشری

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور مملکتِ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور مملکتِ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔ ❁

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا: ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں زہر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں، فرمایا: ”میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔“ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔“ اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا پھل اس سال کم آئے، یا کم ٹھہرے آپ کا پھر گزر ہوا، تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں۔“ پھر فرمایا:

((أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دَانِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ)) ❁

”میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ)) ❁ ”تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔“

تیسری روایت کے الفاظ ہیں:

((فَانِي إِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًا فَلَا تَوَاحِدُونِي بِالظَّنِّ وَلَكِنْ إِذَا حَدَّثَكُمْ عَنِ اللَّهِ شَيْئًا

❁ حجة الله البالغة، باب بيان اقسام علوم النبي ﷺ، ج ۱، ص ۱۰۲ پر اس کی تشریح موجود ہے۔

❁ مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعاً.....: ۶۱۲۷۔

❁ ایضاً: ۲۱۲۸۔

فخذو بہ فانی لن اکذب علی اللہ عزوجل)) ❁

”میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو، کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔“

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ سمجھ آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرمادیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوہ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آ کر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا: ”مخض رائے ہے۔“ تو عرض کی کہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿وَشَاوِدْهُمُ فِي الْأَمْرِ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵۹) یعنی ”مور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو۔“ کا حکم خدا کی طرف سے ہے چنانچہ غزوہ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا، ❁ لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں، بلکہ وحی الہی یا فہم نبوی ﷺ سے ہوا تھا اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کی شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحت الہی اور حکمت ربانی پر مبنی تھے ان کے بدلنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوہ احد جیسے نازک موقع پر عبد اللہ بن ابی کاتین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحت الہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت مشق اور کثرت عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عیسق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لائیخل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں جی کی طرح معمولی ہوتی ہے ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی

❁ ایضاً ۲۱۲۶۔ ❁ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶۲؛ البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص: ۹۵؛ کامل ابن اثیر،

صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زور و فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکہ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً: پہننے، اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، جنگ و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج، وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کامصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں، جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جاہلانہ حکومت نہ ہو لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو و علیٰ ہذا القیاس۔ الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الہی کے خلاف تھا۔

### ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں وحی، ملکہ نبوت اور عام عقل بشری ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکہ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علمائے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں سلف و صالحین میں سے بعض نے اس کو القانی الروح (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ تمیز سے تعبیر کیا ہے۔ \* امام غزالی و

\* یہ تمام الفاظ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔



امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکہ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوت اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ”علم نبوت“ ہے جس کو کہیں ذکر (یاداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھادینا) کہیں اراست (دکھادینا، سوجھادینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حکمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت

انبیاء صلی اللہ علیہم وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیم علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَهُم مَّا لَمْ يُرِيدُوا﴾

(۴/النساء: ۵۴)

”تو بے شبہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخش۔“  
حضرت لقمان علیہ السلام کی نسبت ہے:

(۲) ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ﴾ (۱۲/لقمان: ۱۲)

”اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کی شان میں ہے:

(۳) ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ﴾ (۲۰/ص: ۲۰)

”اور ہم نے داؤد علیہ السلام کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔“

(۴) ﴿وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ﴾

(۲/البقرة: ۲۵۱)

”اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے، اس میں سے کچھ سکھایا۔“

حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ فرماتے ہیں:

(۵) ﴿قَدْ جُنْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِابْنِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۶۳)

”میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔“

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے:

(۶) ﴿وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ (۵/ المائدہ: ۱۱۰)

”اور یاد کر جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراہ اور انجیل کی تعلیم دی۔“

عام انبیاء کے متعلق ہے:

(۷) ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾

(۳/ آل عمران: ۸۱)

”اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔“

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَامُ نے آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

(۸) ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۲۹)

”ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور

ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے انکی یہ دعا قبول فرمائی:

(۹) ﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۵۱)

”جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا وہ تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو

کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں

ہم پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۶۴)

”یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہیں الفاظ میں سورہ جمعہ میں دہرایا ہے:

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲/ الجمعة: ۲)

”وہی اللہ جس نے ان پر پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۲) ﴿وَكُلُوا مِمَّا فُضِّلَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَهَيَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَصُدُّونَكَ مِن شَيْءٍ ؕ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۱۳)

”اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہ پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔“

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے:

(۱۳) ﴿ذَلِكَ وَمَا أُوتِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۳۹)

”یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔“

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱۴) ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ لِيُعَظَّمَكُمْ بِهِ﴾

(۲/ البقرة: ۲۳۱)

”اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو خدا تم

کو اس سے سمجھاتا ہے۔“

خاص طور سے ازواجِ مطہرات کو خطاب ہے:

(۱۵) ﴿وَأَذْكُرْنَ مَا يُبْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَةِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۴)

”اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔“

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

(۱۶) ﴿يُنَزِّلُ الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ﴾

(۲/ البقرة: ۲۶۹)

”اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخش دی گئی اس کو بڑی دولت

(بھلائی) دی گئی۔“

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

(۱۷) ﴿أَذْخُرْ لِي سَبِيلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۗ﴾

(۱۶/ النحل: ۱۲۵)

”اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف، تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے

عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔“

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۖ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ التُّدْرُوكَ﴾

(۵۴/ القمر: ۵-۴)

”اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، مؤثر حکمت، تو ان کو ڈر

سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔“

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئیں ہیں جن میں ”حکمت“ کا لفظ آتا ہے ان آیتوں میں

حکمت کا لفظ کہیں تھا آیا ہے اور کہیں ”کتاب“ کے بعد آیا ہے کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک صحیفہ

ربانی کے معنی میں اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتہ الہی اور علم الہی جیسے ﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ﴾

”اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا۔“ ان سابقہ آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی، یا

یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات و قرآن وغیرہ مراد ہے لیکن ”حکمت“ کا مفہوم ان آیتوں میں کیا

ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے؟ اس تحقیق کے

لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب ”جمهرة اللغة“ میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فكل كلمة وعظمتك اوز جرتك اودعتك الى مكرمة اونتهتك من قبيح فهمي

حكمة وحكم. ❁

”ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔“

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغة میں لکھتا ہے:

الحكمة من العلم والحكيم العالم و صاحب الحكمة والحكيم المتقن

للامور. ❁

”حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔“

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم. ❁

”اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔“

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة

الاشياء ايجادها على غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات و فعل

الخيرات. ❁

”اور حکمت، علم اور عقل سے سچی اور صحیح بات کو جاننا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کو جاننا اور ان کو

بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔“

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا چاہیے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلال اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابن حبان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے: ❁

(۱) قال مالك وابورزين: الحكمة الفقه في الدين والفهم الذي هو سحجية

ونور من الله تعالى.

❁ جمهرة اللغة، ج ۲، ص ۱۸۶، حیدرآباد۔ ❁ صحاح اللغة، ج ۲، ص ۶۲۷، مصر۔

❁ لسان العرب، ج ۱۵، ص ۳۰، مصر۔ ❁ مفردات القرآن، ص ۱۲۶، مصر۔

❁ زبیر آیت ﴿وَأَنْعَمْتُ فِيهِمْ، سَوَّلَا مِّنْهُمْ﴾ الآية: ج ۱، ص ۳۵۳ مطبوعہ سعادت مصر۔

”امام مالک اور ابوہریر کا قول ہے: حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔“

(۲) وقال مجاهد: الحكمة فهم القرآن.

”مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔“

(۳) وقال مقاتل: العلم والعمل به لا يكون الرجل حكيمًا حتى يجمعها.  
”مقاتل کا قول ہے: حکمت، علم اور علم کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم و عمل دونوں کا جامع نہیں۔“

(۴) وقيل: الحكمة القضاء.

”بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔“

(۵) وقيل: ما لا يعلم الا من جهة الرسول.

”کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔“

(۶) وقال ابو جعفر محمد بن يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلاً صحيحًا فهو حكمة.

”ابو جعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔“

(۷) وقيل: وضع الاشياء مواضعها.

”کسی کا قول ہے: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنا حکمت ہے۔“

(۸) وقيل: كل قول وجب فعله.

”ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔“

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) قال (مالك): المعرفة بالدين والفقہ في الدين والاتباع له.

”مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔“

(۲) قال ابن زيد: الحكمة الدين الذي لا يعرفونه الا به ﷺ يعلمهم اياها

قال والحكمة العقل في الدين وقرأ: ﴿ومن يؤت الحكمة فقد اوتى خيراً

كثيراً﴾ وقال يعيسى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل وقرأ ابن

زيد: ﴿واتل عليهم نبا الذي اتيناه ايتنا فانسلك منها﴾ قال لم ينتفع بالآيات

حين لم تكن معها حكمة قال والحكمة شيء يجعله الله في القلب نور له به۔

”ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہیں کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ”جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراہ اور انجیل سکھاتا ہے۔“ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ”ان کو اس کا حال سناؤ جس کو میں نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔“ یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کہ ان کے پاس حکمت نہ تھی حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔“

(۳) عن قتاده: والحكمة ای السنة.

”قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی سنت نبوی۔“

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

(۴) قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحكمة انها العلم باحكام الله التي لا يدرك علمها الا ببيان الرسول ﷺ والمعرفة بها وما دل عليه ذلك من نظائره وهو عندي مأخوذ من الحكم الذي بمعنى الفصل بين الحق والباطل. ❁

”ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔“

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(۵) وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقران يقول: الحكمة سنة رسول الله ﷺ. ❁

”میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔“

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسنته الحكمة التي في روعه عن الله عز وجل. ❁

❁ تفسیر طبری، الجزء الاول، ص: ۴۱۵، مصر ❁ الرسالہ، ص: ۲۴۔ ❁ ایضاً، ص: ۲۸۔

”اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔“

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کُل کے کُل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ، بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقرا کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف و صحیح دیتے ہیں اسی کا نام آپ صحت وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشا پر ادازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے وہ ان امور کے اس کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے یہی وہ معرفت اور نور الہی ہے جو جدوجہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام ”حکمت“ ہے۔

دوسری زبانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مراتب عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر ”حکمت“ کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت، جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول



ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

﴿ذَلِكَ وَمَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۳۹)

”یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔“

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں، جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حس اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلائل و بیّنات اور عالم گیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ”حکمت والا قرآن“ ظاہر کی ہے ﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾ (۳۱/ لقمان: ۲، ۱۰۴/ یونس: ۱) ﴿وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾ (۳۶/ یس: ۲) ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ﴾ (۳/ آل عمران: ۵۸) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ”حکمت“ کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحی الہی خود اپنے اندر کبھی شامل کر کے ان کو آب مقطر بنا دیتی ہے یہ چیز انبیاء کو کتاب کی وحی الہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے۔ فرمایا:

﴿وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ﴾ (۳/ آل عمران: ۸۱)

”اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔“

بہر حال یہ حکمت کی قوت انبیاء ﷺ کو بدرجہ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات، دانائی اور ان کا ہر کام، دانش مندی پر مبنی تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس قوت کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور جن کا یہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق کے اندر داخل ہوا۔ پندرہویں آیت میں ہے:

﴿وَأَذِّنْ لَهُمْ مَا يَشَاءُ ۗ فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۗ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۴)

”(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں

سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔“

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیات الہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانائی کی وہ باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے:

﴿وَيَعْلَمُوهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۶۲/ الجمعة: ۲)

لفظ ”یعلّمون“ سے کسی کو شہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لیے خاص ہو کہ آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سنا تھے بلکہ الفاظ الہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

”وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی، کہ جو چیز ان کے پاس نہیں وہ دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، تو جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی وہ تعلیم فرماتے ہیں اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۶۳)

”میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنی اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی، بارہویں آیت میں ہے:

﴿وَلَوْ كُنَّا فَضَّلَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَرَحْمَتَهُ لَهَيَّتَ لَكَ آيَةً فَتَهْتَمُ بِهَا وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَصُدُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۱۳)

”اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہتا تھا کہ تجھ کو گمراہ کر لے، اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔“

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کار گرنے ہوئی اور وہ تجھ کو بہکانہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتاب الہی کے ساتھ حکمت ربانی کے

قرآن پاک میں حرف علت سے قبل ”وَاَوْثَارًا“ آتا کرتا ہے جسے ﴿وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۶/ الانعام: ۷۶) یہ حرف عطف نہیں۔

انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینہ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کے اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی کے مناظرہ کرنے میں سب سے اول اسی کو جگہ دی گئی ہے:

﴿ اذْعُرْ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيِّ هِيَ أَحْسَنُ ۗ ﴾

(۱۶/ النحل: ۱۲۵)

”تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔“

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی ہے اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فرمایا:

﴿ حِكْمَةٌ بِاللِّغَةِ ۗ ﴾ (۵۴/ القمر: ۵)

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿ وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أَوْفَىٰ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۹)

”جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی (دولت) دی گئی۔“

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

﴿ إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةٌ، إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا ۗ ﴾

”بعض شعر حکمت ہیں، اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔“

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریر و بیان کو جادو کہا گیا ہے۔ اس تقابلی سے ظاہر ہے کہ اس عربی حکمت کا مفہوم اردو حکمت کے مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے ما فوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی ما فوق بشری تخیل ضرور ہے اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اردو میں اس حقیقت کو ”حکمت“ کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے یعنی ”الہامی حکمت“

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما يجوز من الشعر والرجز..... الخ: ۶۱۴۵ میں پہلا فقرہ اور کتاب الطب، باب ان من البيان سحر: ۵۷۶۷ میں دوسرا فقرہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”رَشْكٌ وَحَسَدٌ اِذَا جَا زَجْرٌ هُوَ تَوْصِفُ وَدُوخٌ مِّنْ رِّجْسٍ كَوَالِ كِي دَوْلَتِ لِي تَوَدُّهُ اِسْ كَوْ صَحْحٌ مِّنْ صَرَفٍ مِّنْ لَنَا تَا هِي اُو رُو سَرِ ؕ ((رَجُلٌ اَتَاهُ اللّٰهُ اَلْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) \* ” اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے۔“ جب یہ عام انسانوں کا درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصولِ دولت یعنی عطاءِ حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ ماہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات جو تمام ترویجی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

### کتاب و حکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸-۹-۱۰-۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

﴿يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ﴾ (الجمعة: ۲)

” (وہ رسول) ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنواتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔“

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے:

- ① خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔
- ② ان کو شرک اور بد اخلاقی کی نجاستوں سے پاک و صاف کرنا اور سنوارنا۔
- ③ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں، تو اس بے سود تکرار کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یسنلوا یعنی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنانا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے، خصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے وحی کے الفاظ کو سنانے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنانا اور پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کر دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی

تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام ”کتاب و حکمت کی تعلیم“ ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پینمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ ”احادیث و سنن“ کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ”حکمت“ کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال، جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتاب الہی وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینہ نبوی کی ملبہانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعی کی تحقیق پیش نظر رہے:

وسنة الحكمة التيلقى في روعه عن الله عزوجل - ❁

”اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔“

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحكمة فہم القرآن . حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی، سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابوزرین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ ”حکمت معرفت دین، نقد دین اور اس دینی علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔“

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اہاموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت

مختلف ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کے تعلق سے اس کا جب استدلال دگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

﴿يَا بَتِ اِنِّى قَدْ جَاؤْنِى مِنَ الْعِلْمِ مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (مریم: ۴۳)

”اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔“

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکہف: ۶۵)

”اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔“

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے، پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ مخائب اللہ کہی جاتی ہے اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، وہی علم خدا داد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں:

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا﴾ (النمل: ۱۵)

”اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ﴾

(یوسف: ۶)

”اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نواز دے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت، کی (تاویل) سکھائے

گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔“

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں، جس کا منشا وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تاویل احادیث کا علم بیک دفعہ دیے جانے کا تذکرہ ہے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

﴿ذٰلِكُمْ اِمَّا عَلَّمَنِى رَبِّىْ﴾ (یوسف: ۳۷)

”یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔“

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے، کہ خواب کی تعبیر کے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی

بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء علیہم السلام کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا:

﴿وَبَشَرُوهُ يُعَلِّمُهُمْ عَلِيمٌ﴾ (الذاریات: ۲۸)

”اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔“

﴿إِنَّا نَبِّئُكَ يُعَلِّمُهُمْ عَلِيمٌ﴾ (الحجر: ۵۳)

”ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔“

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔  
علم و حکم

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ کے) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحکم بالشیء ان تقضى بالشیء بانہ کذا أو لیس کذا سواء الزمت ذلك

غیرہ اولم تلزمہ - ❁

”کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکیا نہ کر سکو۔“

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحکم العلم والفقه والقضاء بالعدل - ❁

”حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔“

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا ملنا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے:

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (یوسف: ۲۲)

”اور جب یوسف علیہ السلام جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔“

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿وَلَوْطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (الانبیاء: ۷۴)

❁ مفردات القرآن، ص: ۱۲۶، مصر۔ ❁ لسان العرب، ج ۱۵، ص: ۳۰، مصر۔

”اور لو ط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔“

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر میں ہے:

﴿فَقَهَرْنَاهَا سُلَيْمٰنَ ۗ وَكَلَّمَاۗنَا حٰكِمًا وَعِلْمًا﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۷۹)

”تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔“

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت ہے:

﴿يٰۤيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَ صَبِيًّا ۗ﴾ (۱۹/ مريم: ۱۲)

”اے یحییٰ کتاب (توراة) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔“

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤيَسٰىٓ اِسْرٰٓءٰٓءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَ وَالشُّوْبٰۤءَ﴾ (۴۵/ الجاثیة: ۱۶)

”اور بلا شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔“

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں

حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا، یہ اہل عجم

کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے:

﴿فَاَحْكُمۡ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ﴾ (۳۸/ ص: ۲۲)

”ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

﴿فَاَحْكُمۡ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (۳۸/ ص: ۲۶)

”تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

﴿وَاِنۡ حٰكَمْتَ فَاَحْكُمۡ بَيْنَهُمۡ بِالْقِسْطِ﴾ (۵/ المائدہ: ۴۲)

”اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

﴿وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذۡ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرٰثِ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۷۸)

”اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔“

﴿وَمَا اَخْتَلَفْتُمْ فِيۤهٖ مِنْ شَیْءٍ فَحٰكِمَةُۤ اِلٰی اللّٰهِ﴾ (۴۲/ الشوری: ۱۰)

”اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ، یہی تین باتیں سورہ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر الگ الگ

دہرائی گئی ہیں:



﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ﴾ (٦/ الانعام: ٩٠)

”یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔“

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں: ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط، علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت و سلطنت (اگر ہو) تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمان اور داؤد علیہم السلام اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰ علیہم السلام کو بھی شامل کر لیا جائے باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے، وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالے:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ تَوَلِّيًا لِّلنَّاسِ كُتُبًا آتَىٰ مِنْ

ذُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رٰبِطِيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبِ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾

(٣/ آل عمران: ٧٩)

”کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراة) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعے سے تم خدا والے بنو۔“

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہودی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے، وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

﴿قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّيٰ وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مِمَّا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ۚ

يَقْضِ الْحَقُّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ﴾ (٦/ الانعام: ٥٧)

”کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو،

میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔“

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر

ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے شرح صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق وقعت اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے جہمیرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرح لك الأمر ..... أى أوضحته وكشفته وشرح  
اللہ صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير۔ ❁

”شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ ”میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی“، یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔“

صحاح جوہری میں ہے:

الشرح الكشف تقول شرح الغامض اذا فسرته۔ ❁  
”شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کی تفسیر کر دی۔“

لسان العرب میں ہے:

الشرح الكشف يقال شرح فلان امرى اوضحه وشرح مسئله مشكلة بينها  
وشرح الشيء يشرحه شرحاً وشرحه فتحه بينه وكشفه وكل ما فتح من

❁ جمهرة اللغة، ج ۲، ص: ۱۳۴۔

❁ صحاح اللغة، ج ۲، ص: ۲۶۰۔

الجواهر فقد شرح ايضاً تقول شرح الغامض اذا فسرتة وشرح الله صدره لقبول الخير يشرحه شرحاً فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔  
 ”شرح یعنی کشف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی، یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی تفسیر کر دی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا گیا یا وہ وسیع ہو گیا۔“

قال ابن الاعرابي: الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البيان والشرح الفهم۔

”ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔“

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۖ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۖ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۖ ﴾ (٢٠ / طه: ٢٥-٢٨)

”اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان

کر دے اور میری زبان کی گره کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔“

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں

فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القا اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے، تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی۔

خدا نے فرمایا:

﴿ الْكَلِمَ تَشْرَحُ لَكَ صَدْرُكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۖ ﴾ (٩٤ / الانشراح: ٢٠١)

”کیا ہم نے (اے محمد ﷺ)! تیرے لیے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تھک

سے اتار لیا۔“

شرح صدر اور ”سینہ کھولنے“ کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق

صدر ہے یعنی عالم رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آ کر سینہ مبارک کو دا شگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور

\*\*\*\*\*  
 لسان العرب، ج ٢، ص ٢٩٢، بیروت۔

سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی، اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا، بہر حال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شرح صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے، اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بجا اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورہ زمر میں ہے:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ اللّٰهُ صَدْرَكَ لِلسَّلَامِ وَفَهُوَ عَلٰى نُورٍ مِّنْ نُّورِنَا ﴾ (الزمر: ۲۲)

”بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔“

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوئی یہی شرح صدر کی حقیقت اور ہے اس روشنی کی کمی بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوگی۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ”شرح صدر“ کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی، احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدراول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے بچالیا، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ: ۳۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الى السنوات: ۱۲، ۱۵، ۱۶؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الصلوٰۃ: ۴۴۹؛ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ انشراح: ۳۳۴۶؛ مسند احمد، ج ۲، ص ۱۲۱، عن انس بن مالک۔

فواللہ ما هو الا ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر فعرفت انه الحق. ﴿۱﴾  
 ”تو خدا کی قسم، نہ تھا یہ، لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکر کے سینہ کو، تو میں نے جان لیا کہ  
 وہی حق ہے۔“

② دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر کجا لکھ لیا جائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

فلم يزل عمر يراجعني حتى شرح اللہ صدری لذلك ورأيت في ذلك  
 الذی رأی عمر. ﴿۲﴾

”تو عمر رضی اللہ عنہ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول  
 دیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمر رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے۔“

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورہ زمر کے حوالہ سے گزرا، نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لیا جائے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً: علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوگا جس کو مفعول بنایا ہے، لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا ایک جگہ قرآن میں ہے: ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۰ / الروم: ۷) ”وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں، لیکن دوسری جگہ ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط﴾ (۳۹ / الزمر: ۹) ”کیا جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔“

﴿۱﴾ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۴۰۰۔

﴿۲﴾ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن: ۴۹۸۶۔

یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں، بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں: "هُوَ يَأْمُرُ وَيَنْهَى يُعْطَى وَيَمْنَعُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى" کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالنے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے، یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے، مثلاً: اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، یا جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے، اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیاء علیہم السلام کے لئے سینہ کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اور یہیں سے عام امت اور انبیاء کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتی ہے اور انبیاء کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونوں موقعوں پر لسی اور لک ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے"، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا"، سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت "اور اس لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زنجیری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے ﴿جیسا کہ﴾ ﴿حَلَقَ لَكُمْ مَنَافِيَ الْأَرْضِ بِحَيْعَانِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۹) میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لیے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لیے یا تائید کرنے کے لیے، یا فائدہ کرنے کے لیے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لیے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا تو دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو "افعال و اقوال" اور "احادیث و سنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تعمیر کتاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی

تفسیر کشاف، تفسیر سورة الانشراح، ج ۲، ص ۱۶۱۸ میں علامہ زنجیری کی یہ تشریح موجود ہے۔

شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور، شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الہی نے اپنی کتاب الہی کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیضیاب ہوں وہ علی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے، اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ رتبہ خلفائے راشدین، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام رضی اللہ عنہم کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہا اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یاب علوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے۔ فرمایا:

﴿لَا تَحْزَنْكَ بِهِ لِسَانُكَ لِتَتَعَجَّلَ بِهِ ۗ إِنَّ عَلَيْنَا سَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۗ فَإِذَا قَرَأَهُ قَأْتِهِمُ قُرْآنَهُ ۗ ثُمَّ

إِن عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۗ﴾ (۷۵ / القیامۃ: ۱۶-۱۹)

”تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے، تاکہ تو اس کی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے، ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا، تو تو اس پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کا شرح کرنا۔“

اس ”بیان اور شرح“ کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تو اترے منقول اور احادیث اور سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔ یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝﴾

(۱۶ / النحل: ۴۴)

”اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے، تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔“

”بیان“ اور ”تبیین“ کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ ”تبیین“ اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے، سیاق و سباق

اور موقع محل سے ہو سکتی ہے، مثلاً: ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْقُوْنَا  
عَنْ كَثِيرٍ﴾ (٥/ المائدة: ١٥)

”اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا، کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کر دے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔“

یہاں ”تبیین“ صریح طور کے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں ”تبیین“ کے معنی یقینی طور پر ”اظہار و اعلان“ کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورہ نحل میں اس طرح آیا ہے:

﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّعَالَمٍ  
يُؤْمِنُونَ﴾ (١٦/ النحل: ٦٤)

”اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری، لیکن اس لیے، تاکہ تو واضح کر دے اس کو، جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیے راہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔“

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾

(١٦/ النحل: ٤٤)

”اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لیے کھول کر بتا دے، شاید کہ وہ سوچیں۔“

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے ہیں، ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے لیے نہیں اور غور و فکر کے لیے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لیے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے ہیں۔

اراست

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے، جو ایک طرف



اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گوان کو تمام تر دور نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرادی گوانسانی ذرائع و حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے عہد میں ان نوبتوں اور تازہ بہ تازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اولاد وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور ارادت الہی کے ذریعہ فیصلہ ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا، ہرنے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر، استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج ”فقہ اسلامی“ کہلاتا ہے۔

وحی الہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی، تو اس کے متعلق بھی وحی الہی ناظر ہے:

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرْسَلْنَاكَ اللّٰهُ ط ﴾

(۴ / النساء: ۱۰۵)

”ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ تو لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوچھائے اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرے۔“

اس کتاب الہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تجھ کو سوچھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوچھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام

کے قانون کا وحی الہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٥٨﴾ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٥٩﴾ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمْ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولَهُ ۚ بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٦٠﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٦١﴾ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشِ اللَّهَ وَيَتَّقْهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الصَّالِحُونَ ﴿٦٢﴾﴾ (النور: ٥٨-٥٢)

”اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا، انہیں لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔“

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا بَيْنَهُمْ لَمَّا جَاءُوكَ وَإِنِ اتَّخَذُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّنَّا قَضَيْتَ وَيَسْأَلُوكَ سَلِيلًا ﴿٤﴾﴾ (النساء: ٦٥)

”تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھے اپنے بھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں شک نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔“

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ صُلْبًا مُمِيبًا ﴿٣٦﴾﴾ (الاحزاب: ٣٦)

”اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے، تو ان کو

اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔“

یہ اطاعت اور مطلقاً سرفاقتگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لیے نہیں، یہ انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نور نبوت، فیض حکمت، شرح صدر، تمیز حقیقت اور اراست (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے حکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور تہہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و راہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و راہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و راہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن لَّطِيعُونَ فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْثُوا إِلَيْكُم بَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ ۝ وَكَيْفَ لَكُمْ كُفْرُؤُنَّ وَاللَّتُم مِّثْلَ عَلَيْكُمْ آيَةُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۝﴾

(۳/ آل عمران: ۱۰۰-۱۰۱)

”اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے در آنحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔“

آیت کے آخری لکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس

تھیں ایک تو آیات الہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیض صحبت اور اثر سے ان کو بکنے نہ دے گا اور ضلالت سے مانع آتا تھا اگر صرف کتاب الہی اس کتاب کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بحث کی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

((انی تارك فيكما الثقلين كتاب الله ومستني)) ❁

”مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔“ (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیاء ﷺ کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمدیہ ﷺ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف پہلے دو اوصاف سے الگ ہے یہ پاک و صاف کرنا، آیات الہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حسن اخلاق، بند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار، اختیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء ﷺ کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا ان کا یہ وصف تزکیہ، وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الہی سے مترنم ہو یا خاموش ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

❁ یہ روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب: ۶۲۲۵، ۶۲۲۸؛ ترمذی: ۳۷۸۸؛ دارمی: ۳۳۱۶؛ موطا امام مالک: ۱۶۶۲؛ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹۔

نور

اس لیے نبوت کا سیدہ صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا جسم پیکرِ ظلمت کدہ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۗ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا

مُنِيرًا ۝﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

”اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔“

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول ﷺ کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان، زبان و دل، خلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی رویت

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کو سماعت کرتے ہیں اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿وَكَذَلِكَ نُورِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونُ مِنَ الْمَوْقُوفِينَ ۝﴾

(۶/ الانعام: ۷۶)

”اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔“

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لیے یہ رویت و بصیرت کی مانوق قوت ان کو عطا ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت ﷺ کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿لِيُرِيَهُ مِنَ الْبَيْتَاءِ ۝﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۱)

”تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔“

دوسری جگہ ہے:

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى ۝ أَفَتَمْرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ وَلَقَدْ رَأَىٰ نَزْلَةَ أُخْرَىٰ ۝﴾

(۵۳/ النجم: ۱۱-۱۳)

”دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، اس پر اس سے جھگڑتے ہو اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔“  
﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۚ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۝﴾

(۵۳/ النجم: ۱۷، ۱۸)

”نگاہ نہ ہلکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔“  
ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَلَقَدْ رَأَىٰ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝﴾ (۸۱/ النکویر: ۲۳)

”اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کناروں میں دیکھا۔“

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسہ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

### سماع غیب

جس طرح آیات و ملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسہ سماعت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسہ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۶۴)

”اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔“

حضور کو حکم ہوا:

﴿وَلَا تَجْعَلُ الْقُرْآنَ مِنْ قَبْلِكَ إِلَهًا وَجْهًا﴾ (۲۰/ طہ: ۱۱۴)

”اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔“

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں ”نَادَيْنَا“ ہم نے پکارا، بار بار یہ الفاظ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

### تبلیغ و دعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے، اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سننا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بچھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی

پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلواروں میں چھین ان کو رگ گھل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سراٹھائے اس کو کچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضا مندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ بلا واسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہیں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام، جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کو پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل کر نامہوں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ رَسُولَ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّ اللَّهَ بِأَعْيُنِنَا ۗ وَسَوَاءٌ حَسِبُوا﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۹)

”جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب اعمال کے لیے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

﴿إِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ﴾ (۲۰/ طہ: ۲۴)

”فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔“

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ تمہاری حفاظت کا خود شہنشاہ عالمِ ذمہ دار ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَةَ اللَّهِ ۗ وَنَحْنُ بِمَا تَعْمَلُ﴾

(۵/ المائدہ: ۶۷)

”اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اُتر ہے، اس کو پہنچا دے اور اگر یہ نہ کیا

تو، تو نے اس کے پیغام کو پہنچانے کے فرض کو ادا نہیں کیا، اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔“  
انبیا کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوش خبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا عذاب الہی کا خوف دلانا اور ان کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا اور انبیا کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں پر حجت تمام ہو جائے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۗ﴾

(۴/النساء: ۱۶۵)

”یہ سب پیغمبر خوش خبری سنانے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔“

ان سب نے پیغامِ الہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاصِ مندی کا اعلان کیا:

﴿أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولَ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ۝﴾ (۷/الاعراف: ۶۸)

”میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔“

﴿يَقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ۝﴾

(۷/الاعراف: ۷۹)

”اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، لیکن تم خیر خواہوں کو بیار نہیں کرتے۔“

﴿يَقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آتَى عَلَى قَوْمٍ كَفْرِينَ ۝﴾

(۷/الاعراف: ۹۳)

”اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔“

یہ بھی فرمایا کہ

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۗ﴾ (۱۱/ہود: ۵۱)

”میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو خدا پر ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا۔“

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۗ﴾ (۱۱/ہود: ۲۹)

”میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔“



## ایک شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ ”رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے“ اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف ”وحی الہی کی تبلیغ ہے“ یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہ پہنچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح کا نہ اس کو منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لٹافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ ”رسول“ سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے، کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، ”نبی“ (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتہبی (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا)، مزکی (پاک و صاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) ناهی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقباب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور نہ اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، ﴿إِنَّ هَذَا الشَّيْءَ عَجَابٌ ۝﴾ (۳۸ / ص: ۵) ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کو بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے، کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر وضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں، کہ ”ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے“ ان کا یہ نشانہ نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوش خبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغام الہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الہی کی تمہین و تشریح کرنے والا نہیں، راہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے قرآن میں کئی جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ ﴾ (۱۳/الرعد: ۷، ۷۹/النازعات: ۴۵)

”تو تو صرف ڈرسانے والا ہے۔“

ایک جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَا اَنَا مُنْذِرٌ ﴾ (۳۸/ص: ۶۵) ”میں تو صرف ڈرسانے والا ہوں۔“

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈرسانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے، بشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں:

﴿ اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغَةُ الْبَيِّنٰتُ ۝ ﴾ (۵/المائدہ: ۹۲)

”ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔“

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزرگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد تمہارے کفر و انکار و عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا نشانہ یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

﴿ وَاَقْلٌ لِّلَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيِّنَ ؕ اَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمْتُمْ اَفَقَدْ اٰهْتَدَوْا۟ وَاِنْ تَوَلَّوْا

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغَةُ وَاللّٰهُ بِبَصِيْرٌ بِالْعٰبِدِ ۝ ﴾ (۳/آل عمران: ۲۰)

”کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے، کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا ہدایت پائی، اور

اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول ﷺ) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔“  
مفہوم بالکل ظاہر ہے، کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول ﷺ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا اس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں:

﴿فَاتِمَّا عَلَيْكَ الْبَلْغَةُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد: ۴۰)

”تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔“

اس کی مزید تفصیل سورہ عاشیہ میں ہے:

﴿قَدْ كُذِّبَتْ إِلَيْكَ أَنْتَ مَذْكُورٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّطٍ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ

الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (الغاشیہ: ۲۱-۲۶)

”تو (اے پیغمبر) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر وار و غنیمت نہیں، لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا، تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور ہمیں پران کا حساب ہے۔“

یہی مفہوم سورہ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما، داروغہ اور فرمانروا بنا کر نہیں بھیجا گیا، کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوالے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا قَمَا أَرْسَلْنَاكَ حَفِظًا إِلَّا بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (الشوریٰ: ۴۸)

”تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔“

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے:

﴿قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ سَمِيءٍ إِلَّا أَنْتُمْ لَا تَكْفُرُونَ﴾ قَالُوا

رَبِّنَا يَعْلَمُونَ إِنَّ إِلَيْنَا لَلْآيَاتُ لَكُمْ لَسُّوْنَ﴾ (یس: ۱۵-۱۷)

”کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے جواب دیا، ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم جھجھے ہوئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔“

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے، کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کہا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں، بلکہ ان تک ہمارا پیام پہنچانا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا

حَزْمًا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا  
الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ (النحل: ٣٥)

”اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، کیا ہمارے پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟“

﴿وَإِنْ تَلَدُّوا فَبُؤًا فَكُذِّبَ أَمْرٌ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ ﴿١٧﴾﴾

(٢٩/ العنكبوت: ١٨)

”اگر تم جھٹلاؤ، تو (کیا ہے)، تم سے پہلے بھی تو میں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔“

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے:

﴿مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغَةُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿١٨﴾﴾ (المائدة: ٩٩)

”رسول پر نہیں ہے، لیکن پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے، جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔“

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

﴿وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأَحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا إِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلْغَةُ

الْمُبِينُ ﴿١٩﴾﴾ (المائدة: ٩٢)

”اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔“

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكُمْ مَا حَبَلْتُمْ وَعَلَيْكُمْ مَا حَبَلْتُمْ

وَإِنْ تُطِيعُوا تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ ﴿٢٠﴾﴾ (النور: ٥٤)

”کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں، تو رسول پر وہ ہے، جس کا اس پر بوجھ ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے، اگر اس کی اطاعت کر دے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔“

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ﴿٢١﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغَةُ الْمُبِينُ ﴿٢٢﴾﴾

(١٦/ النحل: ٨١، ٨٢)

”اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا، تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔“

﴿وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَأَنَّا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝﴾

(۶۴/التغابن: ۱۲)

”اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔“

پیغمبر کا قول ہے:

﴿فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أَرْسَلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۝﴾ (۱۱/ہود: ۵۷)

”تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔“  
(یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے، کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، ہند و موعظت اور سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے، اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں، بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت، دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا، کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پریش، اس لحاظ سے انبیا علیہم السلام کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لیے فرمایا کہ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا ۝﴾ (۴۲/الشورى: ۱۳) یعنی ”خدا نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے۔“ لیکن انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جزو توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں، ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی و عظیم بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں، یا ہندوستان کے اوتار، لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں، تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں، کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان، ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۝﴾

(۲۱/الانبیاء: ۲۵)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن ان کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں،

میری ہی پرستش کرو۔“

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۗ﴾

(۱۶/ النحل: ۳۶)

”اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا، کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گونا گونا گئے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل و دعویٰ وہی ہے، جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو، نہ کہ گواہ۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز آکسنت کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمانہ بندگی کی یاد دہانی ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ ۖ أَسْنَتُ  
بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۗ شَهِدْنَا ۗ أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ۗ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۷۲)

”اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی، کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔“

اس لیے ضروری ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے، کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجائے کہہ کر دیں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا، اس لیے فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۗ﴾

(۴/ النساء: ۱۶۵)

”رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔“

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور راہنمائی ہے، کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے

مظہر اور مورد ہیں، اسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لیے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا:

﴿وَلْيَكُنْ قَوْمًا هَادِيًا﴾ (الرعد: ۷)

”اور ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا۔“

سورہ شوریٰ میں فرمایا:

﴿وَأَنَّكَ لَكَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

”اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔“

سورہ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يَهْتَدُونَ يَا مَرْيَمُ﴾ (الانبیاء: ۷۳)

”اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا، جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔“

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو ہدیٰ گئی تھیں، بار بار ہُدٰی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور راہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ وہ بندگانِ الہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، انسان جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي يَنْزِلُ عَلَى عَبْدِهِ لِيُنزِلَ عَلَيْكَ مِنْ أَيْنَ يَشَاءُ مِنَ السَّمَاءِ فِي سُبْحَانَكَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾

(۵۷ / الحديد: ۹)

”وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے، تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔“

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے، جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۗ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۗ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا

تَحْسِرُوا الْمِيزَانَ ﴿٥٥﴾ (الرحمن: ۷-۹)

”اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔“

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے اور بالارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزانِ فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کا نظام درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۗ﴾

(۵۷/ الحدید: ۲۵)

”ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔“

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پر شور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ڈالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلتی ہے، کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحرائی کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو، یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم، یا یوروپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف و تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی،



نیکو کاری، حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسول کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے طہر ہیں ان کو بھی نیکو کاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقرر اور معترف ہیں، اسی لیے انبیاء علیہم السلام کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمة و ہدیٰ، رحمت اور راہنمائی کی غرض سے بھیجے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اسی لیے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آئی، فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

”اور ہم نے تجھ کو (اے محمد!) تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

تائید و نصرت

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ، خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا:

﴿ وَأَقْدَمَ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۖ وَإِن جَنَّادَنَا لَهُمُ

الغالبُونَ ۝ ﴾ (الصفّ: ۱۷۱-۱۷۳)

”اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیے پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا لشکر غالب ہوتا ہے۔“

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی:

﴿ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۗ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ

الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ بِالْعَنَاءِ وَلَا هُمْ سُوءَ النَّارِ ۝ ﴾ (المؤمن: ۵۱، ۵۲)

”اور بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے، جس دن گناہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھینکار ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔“

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعۃً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیے کھول دیے جاتے

ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا ۗ﴾

(۱۲/ یوسف: ۱۱۰)

”یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں

کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی۔“

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت و حفاظت و دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل

لیتے ہیں اور اپنے سروں کو تھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود

اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، منکروں کو

شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تہائی کو دیکھ کر، ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان

کے سوائے ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

﴿ فَلَا يَحْصِبَنَّ اللَّهُ مَخْلَفَ وَعْدِهِ رَسُولُهُ ۗ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۴۷)

”سو تو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔“

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پیکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی:

﴿ كَتَبَ اللَّهُ لَأَعْلَيْنَ أَنَا وَرُسُلِي ۗ﴾ (۵۸/ المجادلة: ۲۱)

”اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔“

خاتمہ: اس تفصیل اور شرح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا:

آبگینہ راز گوہر و اشناس

جز دمے کہ گوہرے آری بدست

آبگینہ شدسیہ چون پرزاغ

نردیاں دارد بخورشید بلند

پس بھاگ افتدنگون گشته سرش

رشتہ افگندہ سوئے خاکیاں

پس بر آتابارگاہ آفتاب

فلسفی از خاک پروازت دہد

فلسفی راز پیمبر و اشناس

آبگینہ راز نہ پنداری بدست

چون گہر آمد بدستت شب چراغ

فلسفی اندر بن چاہ نژد

نردبانش می برد ناچند ارش

و آن پیمبر خود زبام آسماں

رشتہ جان را بدیں رشتہ بتاب

ز آسماں پیغمبر آوازت دہد

ایسن زدورت رہ نماید سوئے جان

و ان بخواند خود ترا از کوئے جان ❁

❁ از دیوان فارسی مولانا حمید الدین بریلوی سنہ ۱۹۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ (۱۹۳۰ء) ذوالحجہ پہلوی، ص ۳۸-۳۹۔

## شبِ ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خشکی سخت اس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاری میں ہوتی ہے اور نضا جس قدر تاریک ہو چکی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لیے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا نے فرما چکے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۗ ﴾ (الفتح: ۱۰)

”جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں

کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔“

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی صورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواتی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجربہ، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مراد سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رو نگئے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث

کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیا سا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی، نفسِ انسانی کی ملوکوتی طاقت جذباتِ خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطرِ معنبر کی خوشبو انسان کے جامہِ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نورِ دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا صلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسانی کا نجات دہندہ، آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں، جو عرصہ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لیے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمتِ افسانہ پارینہ بن چکی تھی خود عرب و مضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً: نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا، جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو، جس کے خیر سے قوم کی

زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بائبل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزداں و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرتع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایک ایسا گورکھ دھندلایا تھا جس سے اخیر تک اس قوم کو ٹکنا نصیب نہ ہوا۔ ❀ اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ایران و یرباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔ ❀ اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیر رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ❀ یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے اوسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا۔ ❀ عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی بد اخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امرا درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کیے جاتے تھے۔ ❀ ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی اور رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گر جاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا ختم سلسلہ قائم تھا جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراہ کے قصۃ البر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گہن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہان بانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا ❀ قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس

❀ کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی، ص: ۵۸، وما بعد و کتاب البدء والتاریخ مقدسی، ج ۴، ص: ۲۴۔

❀ تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس، ص: ۵۰۲۔

❀ ایضاً، ص: ۲۷ و ابو داؤد میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے کتاب

الخروج والامارة والنفی، باب فی اخذ الجزية من المجوس: ۳۰۴۳۔ ❀ مورخوں کی تاریخ عالم، ج ۸، ص: ۸۴۔

❀ غرر اخبار الفرس ثعالبی، ص: ۵۰۰ پیرس۔ ❀ انسائیکلو پیڈیا ریٹیکا ضلع پارو، جلد ۲۱، ص: ۲۲۳۔

پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امر اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔ اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج اور اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا تھا، وہ ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے نکوار کے زور سے دبانے اور کیش زرتشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بیٹا نوشہزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زرتشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا تخت، ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بد نظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری اور امر کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹٹھائی ہوئی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمہ تو حید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزداں و اہرمن، نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھولیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا: ”ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔“

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیے کوئی

✽ غر اخبار الفوس ثعالی، ص: ۵۹۸ تا ۶۰۰ پیرس۔ ✽ تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ، ص: ۲۲۷۴ مطبع بریل۔

دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، ہرجانِ ملکم جن کا مسیحی تعصب، عساکرِ اسلامی کو ان کی زبان سے ”قزاقانِ عرب“ کا لقب دلواتا ہے، فتحِ فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

”یزدجرد و ثالث کا عہدِ حکومت اس لیے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن ”سوسمار خواروں“ کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے، اس انقلابِ عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا (مسلمان) فارسی مؤرخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزہ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد ﷺ کی صداقت کو ظاہر کر دیا تھا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت، جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی تھی، جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بد نظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبر سنی اور نقاہت سے قصر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لیے پر جوش ”قزاقانِ عرب“ کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔“ ❁

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی حسنگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری، قزاقانِ عرب ہی کی ترقی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا نہ تھے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامانِ جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی ”یزداں اور اہرمین“ کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت بر باد کر دی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا، جو عیسائیت اور مجوسیت کا عجیب مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی، یہاں تک تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا ❁ نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبا دیا اور اس کے صلہ میں بادشاہِ عادل و دادگر کا خطاب پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی، جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ اہل کرادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی روم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم گرم خورہ نہ تھی حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد

❁ ملکم صاحب کی تاریخِ ایران جلد اول صفحہ ۱۳۳۔ ❁ تفصیل کے لیے فرسٹ ایندیم دیکھو صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰۔

دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جو لیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لیے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں معوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام بنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نوعیسائی یہودی تھا، اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی اور باپ، بیٹے، روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا اور توراہ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے \* وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی، \* ۳۲۵ھ میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تئلیٹی الوہیت میں ہر بنا ملک جو فتح ہوتا، اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا تھا تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ، کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اس کے لیے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش، نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی، اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف و عویداران حکومت کے حصے میں آئی \* ناقابل فرمان رواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوٹھ، و نڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کیے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دار الحکومت و شہنوں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ \* اس وقت یعنی پانچویں صدی کے سچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے بارہ کرسٹوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے

\* انجیل متی: ۵-۱۷-۱۸۔ \* یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا تصریح مذکور ہیں۔

\* گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، ج ۱، ص: ۴۸۸-۴۹۱۔

\* ایضاً، ج ۲، باب ۳۶ و باب ۳۸۔



پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ مورخ گھن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

”اس پیشین گوئی نے، جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت و بد قسمتی کا سامنا تھا، اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت، مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ❁

امرانے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہو گئی اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرماتے لگی اور رومن حکومت پر ہر وقت وحشی سے وحشی سلطنت کی حکومت کو ترجیح دینے لگی، امراء، وزراء اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بد نظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گھن کے الفاظ میں:

”اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین بھی فنا ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی

سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے بچا نہیں سکتی تھی۔“ ❁

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد، مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر درجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۳۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسنین کے زمانہ (یعنی ۵۲ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و اترتہ حالت میں۔ رعایا کی جیسیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھتی جا رہی تھیں اور امراء و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسرین جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کر لے۔ ❁

❁ ایضاً، ص: ۴۶۱۔ ❁ ایضاً، ص: ۴۶۱۔

❁ حوالہ مذکور، ج ۳، ص: ۱۱۳۔

اندرونی بند نظیموں پر مستزاد یہ تھا کہ میری غنیم اہل روم کو ایک دم کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوٹس اور ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گمن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گمن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تان خشک ہو رہا تھا خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھاپا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویرانہ اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تابل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔ ❁

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے حضرت عیسیٰ اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کے تعین نے میسوں فرقتے پیدا کر دیے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ ❁ اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بنا پر محض جب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، ان پادریوں کے ایک استقف اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلا وطن کرویا اور ان کا مال اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معاہد زمین کے برابر کر دیے گئے، سرل کا حریف ارٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا ❁ سرل کی ایک خاتون دوست بلیشیا نامی تھی ایک روز وہ اپنی درس گاہ

سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھمٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ ❀ یہ ایسے واقعات ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لڑتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ در در از صوبوں اور ملکوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ”شہزادہ اسن“ کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو، نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں اپنی ”تاریخ ہندوستان“ میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

”اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کونجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان، جو چرچ میں ایک بالچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدہم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قصر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جارہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لیے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش اور ناروا دار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنہوں نے ان کے معبود ”آتش شمس“ کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھسے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی اور ان کے انتقام کے لیے آمادہ اور مستعد تھی۔“ ❀

مارس صاحب خود واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال مؤرخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی

❀ ایضاً، ص: ۳۲۷، ۳۲۸ نیز ڈریور تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس صفحہ: ۱۵۵۔

❀ مارس کی تاریخ ہندوستان، ج ۱، ص: ۱۸۳۔

ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیح کی ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل، مصر کو قابو میں لانے کے لیے کی گئی تھی جس سے حضرت مسیح کے ”وہی ایک ہے“ کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعاماگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقدان کو سجدے کرتے تھے، مسیح و مریم، روح القدس اور حوارین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔ ❁

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ”گر جا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کیے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا، اور ایرینس، سلینس، نستورینس اور یوٹیکنس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں، مغربی چرچ میں ڈینس اور ارسلینس نے بشارت کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لیے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینن کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا:

”بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبدل ہو گئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔“ عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے، آنحضرت ﷺ کے

❁ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ۱۸۵۴۔

❁ سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ، صفحہ: ۲۶، ۲۵۔

وقت تک ملک کا مغربی حصہ گلاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا، اس کی تصویر ڈرپہر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ ”دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں \* جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرنلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی انصاف پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا..... عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، مریم عذرا کو تو (خدا کی ماں) کا لقب دیا گیا۔“ \*

اسی زمانہ میں ایک گروہ ”مریمی“ کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقامتِ ثلثہ! کے، اقامتِ اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورہ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم، مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شد و مد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنی پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ \*

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لیے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳ آدمی کام آئے۔ \*

اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لہذا اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ \*

سلاطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پر تو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ

\* معرکہ مذہب و سائنس، ڈرپہر، ص: ۲۴۔

\* ایضاً، ص: ۲۶۔

\* ایضاً، ص: ۶۵۔ ۶۶۔

\* ایضاً، ص: ۲۶۔ ۲۷۔ ۶۸۔

ہوا کہ بد اخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے دردی کے ساتھ اپنے سرفانہ لہو و لعب اور عیاشی میں اڑا ڈالتے۔ ❁

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، مگر آن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿إِنَّمَا أَتَى النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ أَنبَاءُ﴾ (۹/ التوبة: ۳۱) ”انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔“ دینداری کا سب سے اہم جزو تہجد کی زندگی اور رہنمائی تھی ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف دہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلہل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں، باپ اور عزیز واقارب، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے، ان سے پرہیز، بلکہ ان سے نفرت، کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

### ہندوستان

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی بااثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو ویدک عہد، جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک قائم رہا، دوسرا دور جنگ، یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو سال ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما اور عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پراگ جس میں بجائے ویدیا گوتم بدھ کی تعلیمات کے، پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور فحاش سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:

❁ شرک جو ابتداء ہی سے ہندوستان کے خیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۳ یوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ یوتاؤں تک پہنچ گئی۔ ❁

❁ تاریخ اخلاق یورپ لگی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔ ❁ آری دست کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ: ۲۷۶۔

۱۲ ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی۔ ❁

۱۳ مندروں کے محافظین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹے۔ ❁

۱۴ ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لیے تباہ کن تھی۔ ❁

۱۵ عورتوں کو تکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔ ❁

۱۶ تو انہیں اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کیے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا مثال کے لیے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرم مانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ه) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہیے اگر

اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ

میں ڈالنا چاہیے۔ ❁

۱۷ راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامہ عصمت اتار

ڈالنی تھیں۔ ❁

۱۸ شاہراہوں پر آوارہ گرد اور جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ❁

۱۹ خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو

سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

۲۰ اوہام و خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں پلیموں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے

کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سر بسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ بتوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا

شمار اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب

❁ آری دست کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ: ۲۸۱ - ❁ ایضاً ص: ۲۸۳ - ❁ ایضاً ص: ۳۰۷۔

❁ ایضاً ص: ۳۳۱ - ❁ ایضاً ص: ۳۳۲، ۳۳۳ - ❁ ایضاً ص: ۲۶۹۔

❁ آری دست کی ہندوستان قدیم صفحہ: ۲۶۹۔

سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپشا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر افسوس آتا ہے \* اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں ان کے معبدوں میں پجاری عورتوں اور یوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں \* وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جو ووں میں باہری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے \* وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے محروم رہنے کے لیے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں اور اسی لیے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے \* مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرانی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے۔ شوہروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہتا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس مختصر سے خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ابندئے اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہو سکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الہی کی امانت دار بنی، اس لیے قرآن نے ان سے کہا: ﴿وَلَا تَكْفُرُوا بِاللَّهِ قَافِرِينَ﴾ (البقرة: ۴۱) "اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الہی کے منکر نہ بنو"، مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹنے اور ان کی چھاتوں سے بیٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا۔ قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

﴿فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرة: ۷۴)

"ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔"

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر ڈالا، حضرت

\* دیکھو ابو ذریرانی کا سفر نامہ صفحہ: ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹ اور ابلا و قزوینی صفحہ: ۸۱۔

\* سفر نامہ ابو زید، ص: ۱۳۰، ادرا حسن النقاسیم مقدسی، ص: ۴۸۳۔ \* مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔

\* ستیا رتھ پرکاش سمولال گیا رہ: ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰ مطبوعہ سیکس اٹلیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔



موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کوئی پیغمبران میں ایسا نہیں آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا:

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۷۸﴾ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۷۹﴾﴾

(۵/ المائدہ: ۷۸، ۷۹)

”بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے، جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے تھے ان کا کام کتنا برا ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے:

”اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوں، سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلاویں، بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریا کاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے، کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے، کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس خدا سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا۔ بس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزما یا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی اور وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔“

زبور ۸۱ میں ہے:

”اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے بنی اسرائیل! اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں، جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھردوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔“

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد علیہ السلام سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے متعلق یہ بددعا کی:

”کہ تو وہ خدا نہیں، جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، وہ جو شبی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بد کرداروں سے عداوت رکھتا ہے، تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کر دے گا، اے خداوند! اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں میرا رکھنا پین ہے اے خدا! تو انہیں ملزم جان، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب سے نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔“ (زبور ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

”اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں سے اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریا کار اور شرارت سے بھرے ہو۔“

”اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیانا بھرو، اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جنم کے عذاب سے کیونکر بھاؤ گے۔“ (متی ۲۳-۲۷-۳۳)

یعنی یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ (۲/ البقرة: ۶۱)

”اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لیے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔“

﴿قُلْ فَاَلَمْ تَقْتُلُوْا اَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۲/ البقرة: ۹۱)

”کہہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے۔“

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام

ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَامُرُوْنَ

بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۱)

”بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے، تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے۔“

سورہ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا تو اہم کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۶۰،۵۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودیوں حمیر یوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر دردِ داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

﴿قُلِ اصْحَابُ الْأَخْذُودِ وَالنَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾

(۸۵/ البروج: ۴-۸)

”گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔“

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نکالیں:

① ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں، ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا:

﴿مَنْ أٰبَنُو اللّٰهُ وَاٰجِبُوْا كَمَا﴾ (۵/ المائدہ: ۱۸)

”ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔“

﴿وَقَالُوْا لَنْ نَّمَسْكَنَ النَّارَ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (۲/ البقرہ: ۸۰)

”اور کہا، ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، لیکن چند روز۔“

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدّٰرُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَتُّواْ الْمَوْتَ اِنْ

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (۲/ البقرہ: ۹۴)

”کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی

آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔“

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ﴾ (الجمعة: ٤)

”یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔“

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے ادا لیتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الہی کا درجہ دیتے تھے:

﴿يَجْرِفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ﴾ (المائدة: ٤١)

”وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔“

﴿قَوْلٍ لِّلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَسْتَوِيَ بِهِ كُنَّا

فَكِيلًا قَوْلٍ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْتُمُونَ﴾ (البقرة: ٧٩)

”تو پھنکار ہوا ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھنکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھنکار ہو ان پر جو وہ کھاتے ہیں۔“

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے:

﴿وَمِنْهُمْ أَقْبِيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا آمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾

(البقرة: ٧٨)

”اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں، جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔“

احکام الہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا، اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے:

﴿بَدَّ قَرِينًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ لَكِتَابَ اللَّهِ وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(البقرة: ١٠١)

”جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔“

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ اسْتَكْبَرُوا فَفَرِقْنَا لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَأَنزَلْنَا الْقُرْآنَ لِقَابِ﴾

(البقرة: ٨٧)

”کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو، تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔“

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ ”تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟“ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراہ طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلقہ حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نو مسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند! میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کر دوں گا۔“ ❁

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا:

﴿نَمَّا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِبُونَ قَرِيْبًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِآلَائِهِمُ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتِيَنَّكُمْ أَسْرَىٰ نَقْدُوهُمْ وَهُمْ وَهُوَ مُحْرَمٌ عَلَيْهِمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتَتُومِنُونَ بَعْضُ الْكُتُبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۗ﴾ (٢/ البقرة: ٨٥)

”پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔“

② دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہوئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

﴿وَاتَّخِذْ لَهُمْ أَحْرَصَ النَّكَاسِ عَلَىٰ حَيَاتِهِ وَمِنْ الَّذِينَ أَسْرَكُوا يَوْمَئِذٍ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعْتَرَّ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (٢/ البقرة: ٩٦)

”ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔“

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور نبھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح سختی اور بددیانتی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس

❁ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب احکام اهل الذمة واحصانهم اذا زنوا ورفعوا الی الامام: ٦٨٤١؛ مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الیہود: ٤٤٤٠؛ ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی رجم الیہودین: ٤٤٤٦، ٤٤٤٧۔

معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیل اہل کتاب کی نسبت فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِيْدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمَمِينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (۳/ آل عمران: ۷۵)

(۳/ آل عمران: ۷۵)

”کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لیے دو، وہ

تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں، جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لیے وہ کہتے ہیں

کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔“

توراة میں ”اپنے بھائی“ کے علاوہ ”اجنبی“ سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود

یہود سے نہ لے اور اہل عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سے سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے

اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علما ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علما کی اس

خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

﴿وَتَوَلَّى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَسْأِرُونَ فِي الْأَثِيمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ الشُّحْتَ ط لَيْسَ مَا كَانُوا

يَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾ لَوْلَا يَتَّبِعُهُمُ الزَّبْيِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْأَيْمَةَ وَأَكْلِهِمُ الشُّحْتَ ط لَيْسَ مَا

كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۵/ المائدة: ۶۲، ۶۳)

”اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے

کی کوشش کرتے ہیں ان کے کرتوت کتنے برے ہیں ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات

بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔“

﴿سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ أَكْثُونَ لِلسُّحْتِ ط﴾ (۵/ المائدة: ۴۲)

”جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔“

﴿وَأَخَذِهِمُ الزَّبْيُ وَالْوَقْدُ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ط﴾ (۴/ النساء: ۱۶۱)

”اور ان کے سود لینے کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز

طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔“

اسی لیے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے

کہ وہ ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا

وَالرَّبِّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ﴾ (۵/ المائدة: ۴۴)

”ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق نبی جو تاجدار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔“

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (٥/ المائدہ: ٤٤)

”اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔“

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جنت اور طغوت کی پرستش میں مبتلا تھے قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكُتُبَ أَمْنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ

بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (٤/ النساء: ٤٧-٤٨)

”اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے، اس پر ایمان لاؤ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔“

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْحَبِئِثِ وَالظَّالِمَاتِ وَيَقُولُونَ

لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا﴾ (٤/ النساء: ٥١)

”کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔“

ادہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم ہے (بقرہ) لیبدا اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔ ❁

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا مشغلہ زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اسی طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لیے کافی ہوگا:

محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے انہوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص محمد (رسول

اللہ منہ لپیٹ لیم) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا، خدا کی قسم! مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بے زار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا، میں نے اس کی بیروی اختیار کی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا، مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے؟ انہوں نے کہا، تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، اپنی بیویاں گروی رکھو! انہوں نے جواب دیا، ہم اپنی بیویاں گروی کیسے رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا، اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو کہا، ہم اپنے لڑکوں کو گروی کیسے رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں ہم اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ ❀

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہودی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر ان کے بازاری طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ ❀ کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں، موقع پاتے تو بے دردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے۔ ❀ علما اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ لفظی موذغانیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جوہران سے کھو گیا تھا اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانہ توحید اور موسیٰ علیہ السلام کی صدائے طور کی آواز بازگشت تھا وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے کہ

”ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں۔“ (۴ / النساء: ۵۱) اسلام کی اس مصالحتانہ دعوت:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ

شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ ۗ﴾ (۳ / آل عمران: ۶۴)

”اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر، ہم سب متحد ہو جائیں، جو ہم میں تم میں مشترک ہے، ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔“

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نفس میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ﴾

(۹ / التوبة: ۳۰) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے: ﴿يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ﴾ (۵ / المائدة: ۶۴)

”خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔“ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں

❀ صحیح بخاری، کتاب المغازی، قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷۔ ❀ دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی حصہ اول پر غزوہ بنی نضیر کے اتفاق سب کے پیش آنے کا ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کی بیوی غناب پوش یہودی کی دکان میں آئی تو یہودیوں نے اس کی بے حرمتی کی ایک مسلمان نے غیرت سے بے تاب ہو کر یہودی کو قتل کر ڈالا۔ ممکن ہے کہ سید صاحب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ ❀ صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب من افاد بالحقیر: ۶۸۷۹۔



ہوسکتا کہ ہمارے دل ناختون ہیں: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ط﴾ (البقرہ: ۸۸) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کھو چکے تھے ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے سن کر شیب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔ ❁

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

## ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی، تو اس کا پائے تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعۃً تباہ و برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ ﴿قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلہ یمن سے نکلے، ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو عسائی خاندان کہلاتا ہے۔ ﴿چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لیے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھا اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ وراز سے ایک خدا کے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبائے دستیاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ہلہ ہے۔ عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید الہی عبد الہی ﴿خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:

﴿اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لیے اس کی تعیین میں کمی نظر ہے ہیں ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بننے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان) ﴿اکثر علمائے انساب کا بیان یہی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن یمن نے ارض القریٰ ان میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان) دیکھیے حصہ اول زیر عنوان سہا و حیر۔ "ص" ﴿مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، صفحہ ۳۶۳، بحوالہ پروفیسر فولد کی۔

﴿وَإِن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ط﴾ (۳۱/ لقمان: ۲۵)

”اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ بول انھیں گے کہ خدا نے۔“

یہ اصل میں حضرت ابراہیم عَلَيْهِ السَّلَام کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گو اللہ ان میں سب سے بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر انہیں خداؤں سے پڑتا تھا اس لیے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سارہ گیا، انہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، انہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

﴿وَإِذَا ذَكَرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذَكَرَ الَّذِينَ مِنْ

دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۴۵﴾ (۳۹/ الزمر: ۴۵)

”اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ، جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو وہ دفعۃً کھل جاتے ہیں۔“

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر دنیا و قربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ط﴾ (۳۹/ الزمر: ۲۳)

”ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔“

ملائکہ کی الوہیت: شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْتُؤْنِنُ السُّلَيْكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَى ﴿۵۳﴾ (۵۳/ النجم: ۲۷)

”جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔“

﴿الَّذِينَ لَا يَدْرُونَ لَوْلَا أَلَمُ الْأُنثَى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَى ﴿۲۲﴾ (۲۱، ۲۲/ النجم: ۲۱، ۲۲)

”تمہارے تولڈے ہوں اور خدا کے لڑکیاں! یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔“

اس لیے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں

کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

﴿وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُكَذِّبُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّنَ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۳/ آل عمران: ۸۰)

”اور نہ تو خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔“

﴿وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ﴾ ﴿أَمِ اتَّخَذَ مِنَّا بَنَاتٍ وَإِذَا نُسِئْتُمْ بِالْبَنِينَ﴾ ..... ﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبُدُ الرَّحْمَنِ أَنْثَاءً﴾  
 ﴿أَشْهُدُوا خَلَقْتَهُمْ سَمَكْتَبٍ شَهَادَتُهُمْ وَيَسْتَلُونَ﴾ ﴿وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۱۵-۱۶-۱۹-۲۰)

”اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔“

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ﴾ ﴿أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ﴾ ﴿أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ آفِكِهِمْ لَيَقُولُونَ﴾ ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ ﴿﴾ (۳۷/ الصّفت: ۱۴۹-۱۵۲)

”تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا، وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔“

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے۔ خدا نے اس کی تردید میں کہا:

﴿وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا﴾ (۵۳/ النجم: ۲۶)

”اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔“

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

﴿يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ﴾ ﴿﴾ (۳۴/ سبا: ۴۰)

”پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔“

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کے عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿ وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسْبًا ﴾ (۳۷/ الصَّفَّت: ۱۵۸)

”اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنا دی۔“

اس لیے وہ جنات کو خدا کی خدائی کا شریک کرتے تھے:

﴿ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنِّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾

(۱۰۰/ الانعام: ۱۰۰)

”اور انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔“

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری تھی چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کو بھی پوجا کرتے تھے ﴿ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَهْمُهُمْ شَوْمُنُونَ ﴾ (۳۴/ سبأ: ۴۱) ”بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھتے تھے۔“ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے: ﴿ وَأَنْتَ أَكْبَرُ مِنْ رِجَالِهِمْ مِنَ الْأَنْسِ يَتُودُونَ رِجَالَهُمْ بِالنَّجِيِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ﴾ (۷۲/ الجن: ۶) ”اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا تھا۔“ چنانچہ بعض مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ ﴿ قَبِيلَهُ خِرَامَةَ كِي شَاخٍ بَنُو لَيْحٍ خَاصٌ طُورٌ سَ مِنْ جِنِّ كِي يُوْجَا كَرْتِي تَحْتِي اَوْر كَلْبِي كَا بِيَانِ هِي كِهْ اَنْبِيْسِي كِي مَتَلَقِي يِهْ اَيْتِ اَتْرِي هِي ﴾

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أَمْثَلُكُمْ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۹۴)

”خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔“

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لیے تھے اور جاہل عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے۔ یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، اٹھالیا اور اس کی پرستش شروع کر دی، زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو بھیک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک تو وہ بنا لیا ایک بکری لا کر اس کا دو وہ اس پر دھویا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ: ۶۷۳ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالى: اولئك الذين يدعون يبتغون الي ربهم الوسيلة..... ۷۵۵ تا ۷۵۶۔

لسان العرب لفظ سکن، ج ۲، ص: ۱۷۴۔ ﴿ كتاب الاصنام هشام الكلبي مطبوعه مصر، ص: ۳۴۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لُحی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بلقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لیے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزنی تھے۔ منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کاج کرتے تھے کعبہ کاج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام پہیں آ کر اتارتے تھے، حلیفہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے: ❁

انی حلفت یمین صدق برة بمناة عند محل آل الخزرج

”میں نے منات کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔“

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔ عزنی ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: ❁  
وَاللَّاتِ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ إِنَّهُنَّ الْغَرَابِيقُ الْعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَىٰ.

”لات، عزنی اور تیسرا منات یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔“

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحب زادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی کہند رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سائڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ ❁ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر ”ہاں“ ایک پر ”ناں“ لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے بیماری سے کہتے فال نکالے، ہاں کا تیر نکلتا تو اس کو کھرتے ورنہ باز رہتے۔ جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں اصنام و اوثان، انصاب اور بیوت۔ اصنام و اوثان جن کا واحد ضم اور وثن ہے یہ انسانی شکل و صورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالے سے بننے تو ان کو دومیہ کہتے، انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے

❁ یہ پوری تفصیل عمم البلدان لفظ مناة، ج ۸، ص ۱۶۸، ۱۶۷ میں ہے۔

❁ معجم البلدان لفظ لات، ج ۶، ص ۱۶۶ و کتاب الاصنام للکلبی، ص ۱۹۔

❁ نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام، ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے۔ بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رام، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیے جاتے تھے جن بتوں کے ارد گرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجم کہتے تھے۔ جاہلی شاعر کہتا ہے:

كما طاف بالر حمة المرتجم

”جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔“ ❁

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی انکی کوئی انتہاء تھی۔

ع قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت تھے ❁ ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزی (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعوق (۶) نسر (۷) دد (۸) سواع (۹) بعل۔ لیکن جاہلیت کے پرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاضنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۲ء میں حشیہ اور تکرار کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکرار میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المنقہ، عشار، بکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۲۶ھ / ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزی	قریش و بنو شیبان بن جابر۔
منات	اوس و خزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنو مدح اور اہل جرش۔
یعوق	بنو ہمدان اور اہل خیوان۔

❁ ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔

❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ابن رکن النبی ﷺ الراية.....: ۴۲۸۷۔

نسر	حمیر۔
وذ	بنو کلب۔
سواع	بنو لحيان۔
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
ناکہ	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاء لحم و جذام و عاملہ و غطفان۔
باجر	از دو طی و قضا۔
ذوالخلصہ	بنو امامہ، نعم، بجالہ، از دالسراة۔
رضایارضی	بنو ربیعہ کابت خانہ۔
رمام	حمیر کابت خانہ۔
سبحہ	
سعد	بنی ماکان بن کنانہ۔
سعیر	عزہ۔
ذوالشرکی	بنو حارث۔
عائم	از دالسراة۔
عمانس یا عمیانس	خولان۔
قلس	طی۔
ذوالکفین	بنو دوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزنیہ۔
ہبل	قریش۔
بعل	قبائل بنی عدنان۔
بغیوب	حدیلہ (بنی طی)۔
اہبل	بنو عبدالاشہل۔
اوال	بکر و تغلب۔



بِس	غطفان کا بت خانہ۔
بعیم	ایک لکڑی کا بت۔
بلج	ایک بت۔
بید	ایک بت۔
جُریش یا جَریش	ایک بت جس کی طرف عبد جَریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنو عبد الدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل	حجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے۔
شس	بنو عبد شس۔
صدا	عاد کا بت۔
صمودا	عاد کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداس سلمیٰ کا قبیلہ۔
ضیران	منذرا کبر۔
عجوب	قضاہ۔
عوض	بکر بن وائل۔
عوف	ایک بت کا نام۔
غغب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔
فراض	سعد العشیرہ۔
کشرئی	جدیس و طسم۔
کسعہ	ایک بت کا نام۔
محرَق	بکر بن وائل۔
مدان	عبدالمدان۔
مرحب	حضر موت۔

مہذب	ایک بت کا نام۔
ہبہا	عاد۔
ذات الودع	ایک بت کا نام۔
یایل	عبدالیل۔

## ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لیے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

﴿لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ (٤١ / خم السجدة: ٣٧)

”نہ سورج کو سجدہ کرنے چاند کو۔“

یمن میں سبکی قوم سورج ہی کو دیوی مانتی تھی (٢٤ / النمل: ٢٣) یمن کے بادشاہ شمر عرش نے سورج دیوی کا مندر بنوایا تھا۔ سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعری کی بڑی قدر و منزلت تھی، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشُّعْرَى﴾ (٥٣ / النجم: ٤٩)

”اور وہی خدا شعری کا مالک ہے۔“

صاعد اندلسی التوفی ٢٦٢ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دیران کو، نجم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعری العبر کو اور اسد عطار کو۔

جن اور شیطین اور بھوت پلینت

جن اور شیطین کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن اور شیطین بھوت پلینت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گواختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجنبہ ہنگوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبید بن ایوب الغیری

وغولا قفرة ذكر وانثی کان علیہما قطع البجاد

”اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر مکمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔“

تاریخ ملوک الارض حمزة اصفہانی، ص: ١١ کلکتہ۔ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی، ص: ٤٣ بیروت۔

مونٹ کو سعالاً کہتے تھے:

ازل وسعالاً وغول بقفرة اذا الليل وارى الجن فيه ارتت  
”میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں  
بھوت آواز دیتے تھے۔“

عمر و بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعالاً سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی  
راجز کہتا ہے:

يا قاتل الله بنى السعالاة  
”خدا سعالاً کے فرزندوں کو مارے۔“  
بلقیس ملکہ، یمن (ان کے زعم میں) سعالاً ہی کے پیٹ سے تھی۔  
یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نعموں سے محفوظ ہوتے تھے:

کم حبيت دونك من بهماء مظلمة تبه اذا ما مغنى جنه سمرا  
”کتی اندھیری گھپ راتوں میں، میں نے صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ  
گوئی کر رہا تھا۔“

یہ صحرائشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے یہ  
بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے، لیکن جب ان کو کھانے پر بلا تے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا  
نہیں کھا سکتے۔

اتوانارى فقلت ممنون انتم فقالوا الجن قلت عمواظلمما  
دعوت الى الطعام فقال منهم زعيم نحسد الانس الطعاما  
”وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم جن ہیں، میں  
نے کہا: اس تاریکی میں خوش رہو۔ میں نے ان کو کھانے کے لیے بلایا تو ان میں سے ایک  
سردار نے کہا: ہم انسان کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔“

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضوعوں کے نام بدی بقار اور عبقر تھے:

ع: جن البدی رواسیا اقدامها  
”بدی کے جن، جن کے قدم جنے  
تھے۔“

ع: تحت السنور جنة البقار  
”زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔“

ع: علیہن فتیان كجنة عبقر

”اور ان پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔“

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو اٹھا کر لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ عمرو بن عدی نے جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جدیدہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خزانہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا کے لے گئے تھے مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب

باتیں بیان کرتا تھا۔ ❁

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں تابطشر اور ابوالبلاد طہوی زیادہ مشہور تھے۔ طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت گوت کو مار ڈالا اس کے واقعات ایک لفظ میں لکھے ہیں:

لقيت الغول تسرى في ظلام

فصدت وانتحيت لها بعض

حسام غير مؤتشب يمانى

فقد سراتها والبرد منها

فخرت للبين والجن ❁

”میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلنے ہیں گواس نے روکا اور میں یمن کی بنی

ہوئی اصل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زہروں کو کاٹ ڈالا

اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔“

انہیں اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار

کیا۔ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں

پر ان کا کس قدر استیلا تھا:

﴿يَعْتَصِرُ الْجَنِّ قَدِ اسْتَكْبَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ وَقَالَ أَوْلِيَاهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتِعْ بِبَعْضِنَا

بِبَعْضٍ﴾ (۶/ الانعام: ۱۲۸)

”اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا اور ان کے دوست دار انسان

بولے، اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔“

❁ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر: ۲۵۱۔ ❁ یہ تمام تفصیل کتاب الخیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اس نے کئی درجہ میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، دیکھو کتاب تذکرہ صفحہ ۳۸ تا ۸۰ ج ۸ چشم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر۔

## کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن ✱ رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل و صورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے سے ایک آدمی گزرا انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا: میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم ترالی الجن وابلاسها وباسها من بعد انكاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها۔  
 ”کیا تم جنوں کی سراپیسگی ان کی ناامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سچ کہتا ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں جنوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا:

يا جليح امر نجيح رجل فصيح يقول لا اله الا الله۔

”اے جلیح، کامیاب امر، ایک فصیح شخص لا اله الا الله کہتا ہے۔“

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی صحیح بخاری (تفسیر سورہ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لیے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

انى ارجوان يكون شيطانك قد تركك۔ ✱

”میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔“

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی

جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَكْوَلُ الشَّيْطَانُ ۚ تَكْوَلُ عَلَىٰ كُلِّ آكَاثٍ أَثِيمٍ ۚ يُلْقُونَ السَّمْعَ

وَأَكْثَرُهُمْ كَذِبُونَ ۗ ﴾ (الشعراء: ۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اترتا ہے جو سنی

سنائی بات القا کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

✱ کتاب البیان والتبیین للمجاہد، ج ۱، ص: ۱۱۳ مطبوعہ علمہ مصر۔

✱ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ والضحیٰ: ۴۹۵۰۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطح، غزی بہت مشہور تھے جاہل نے ان کے کاہنہ فقرے، کتاب البیان، ج ۱، ص: ۱۳۳ میں نقل کیے ہیں:

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نذر المجد بنی الشعراء للمجد السناء۔

”قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنوعشر پر غالب آگئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔“

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف اور مقفی اور مسجع فقرے ہوتے، اس لیے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

ارایت من لا شرب ولا اكل ولا صاح فاستهل اليس دمه بطل۔ ❁  
غور فرمائیے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیانا نہ چمکانہ رویا، کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔  
آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے۔“

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لیے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔ ❁

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ انہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سیتکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعرا کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے، چنانچہ خیال شاعر کی شیطان، عمرو کی بیٹی تھی اور اعمش جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعمش خود کہتا ہے:

❁ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الکھانة، ۵۷۵۸، ۵۷۶۰؛ صحیح مسلم، کتاب القسامة، باب دية الحنين: ۴۳۹۱۔ ❁ بخاری، کتاب، الطب، باب الکھانة: ۵۷۶۱۔

دعوت خلیلی مسحلا ودعوالہ  
 بجھنام یدعی للہجین المذمم  
 حبانى اخى الجنى نفسى فداءه  
 یاقبح جیاس العشیات مرجم ❁  
 ”میں نے اپنے دوست مسکل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لیے جہنم کو پکارا اور یہ مکینہ بد  
 اطوار کے لیے بلایا جاتا ہے، مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو، شاموں  
 کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت پتھر اڑ کرنے والے کو دیا۔“  
 جو اعلیٰ درجے کا شاعر ہوتا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابوالنجم کہتا ہے:

انى وكل شاعر من البشر شیطانة انثى وشیطانی ذکر۔  
 ”ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔“

شفتنان اور شیبان رؤسائے شیطان تھے جو شاعری سکھلاتے تھے۔ ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا  
 معلم اسی شیبان کی اولاد سے ہے:

ولى صاحب من بنى الشیبان  
 فطورا اقول وطورا اھوہ  
 ”میرا ساتھی شیبان کی اولاد سے ہے تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔“

ادہام پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ ❁ یہ  
 اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہلہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک  
 سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی  
 پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے۔  
 بکری کا جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر زہر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی تو اس کو چھوڑ دیتے وہ  
 سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔ کسی شخص کے پاس جو اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ  
 پھوڑ دیتے کہ نظر نلگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے  
 اور سمجھتے کہ اس سے پانی برے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈور وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے واپس آ کر  
 دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی۔ سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن  
 لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے ❁ یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزنی کو گالی دیتا ہے اس کو برس یا جذام  
 ہو جاتا ہے ❁ ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے ❁ اس قسم کے

❁ اسی کے دیوان مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء (اور شعراء النصرانیۃ القسم الثالث، ص: ۳۷۷) میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا  
 بھی دوسرا مصرع اس طرح ہے: جھنام جدعا للہجین المذمم۔ ❁ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قتل الحیات:  
 ۵۲۰۔ ❁ یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ ❁ دارمی، کتاب الصلوٰۃ، باب  
 فرض الوضوء والصلوٰۃ: ۶۵۲۔ ❁ ابن ماجہ، ابواب الطب، باب تعلیق التمام: ۳۵۳۔

سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات و خیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی ان کے اخلاقی معایب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

## جنگ جوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برس برس پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ انہیں لڑائیوں کو مؤرخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هذا الفن لا يتقصاه الاحصاء فاقصرت على ما ذكرت۔

”یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قناعت کی۔“

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عیس و ذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غمر اکا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کی چراہ گاہ میں جا پڑی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کر دیا اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی کلیب جان سے مارا گیا اور بکرو تغلب میں خونریز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقعہ پا کر ایک کو قتل کر دیا گیا اس کے انتقام کے لیے خون کی ندیاں بہیں۔ بکرو تمیم میں ایک چراہ گاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اوس و خزرج مدینہ کے دو قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے، جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے۔ ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔



الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔ ان میں لڑنا اور مرنا جاہلیت کا شرف اور ایک قبیلہ کی آن سچھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفاکی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

### شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے نشق و بجزور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک مے کدہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا، ان کے نام یاد رکھے گئے تھے۔ دوست و احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوئے کھیتے، ان میں اونٹوں کی ہارجیت ہوتی، جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا اور لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے اور کھلاتے اور اپنی اس بے جانیا میں پرفخر کرتے، سامنے فاحشہ عورتیں گاتیں، بجاتیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی      وان تقنصنی فی الحوانیت تصطد  
 ”پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا  
 چاہے تو کر سکتا ہے۔“

متی تاتنی اصبحك كاسارویة      وان كنت عنہا غائباً فاغن وازدد  
 ”جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر  
 نہ آئے تو جا اور بے نیازی کر۔“

ندامای بیض كالنجوم وقینة      تسروح الینسایین برودومجسد  
 ”میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چپٹے ہیں ایک مغنیہ ہے جو شام کو  
 ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔“

رحیب قطاب الحیب منها رفیقۃ      بجس الندیامی بضۃ المتجرد  
 ”اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست اندازی سے مانوس، اس کے بدن  
 کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔“

ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھو: عقد الفرید ابن عبد ربہ، ج ۳، ص: ۴۴ اور امثال میدانی الجز الثانی،  
 الباب التاسع والعشرون فی اساء العرب، ص: ۲۶۰ وما بعد۔

اذ انحن قلنا اسمعينا انيرت لنا  
 على رسلها مطروقة لم تشدد  
 ”جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔“

وما زال تشرابی الخمرور ولذتی  
 ویبعی وانفاقی طریفی ومثلدی  
 ”اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا  
 شعار ہے۔“

ولو لا ثلث هن من لذة الفتی  
 وجدك لم احفل متی قام عودی  
 ”اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میں اپنی موت کی پروا نہ کرتا۔“  
 فمنهن سبقی العاذلات بشریة  
 کمیت متی ماتعل بالماء تزد  
 ”ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ و سیاہ رنگ شراب کا  
 پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔“

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب  
 ببهکنة تحت الخباء المعتمد  
 ”اور دوسری بات گھٹا گھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے  
 حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔“

کریم یروی نفسه فی حیاته  
 ستعلم ان متناغدا اینا الصدی  
 ”میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد  
 معلوم ہوگا کہ ہم میں پیسا کون ہے۔“

وبرک هجود قد اثارت مخافتی  
 بوادبها امشی بعضب مجرد  
 ”اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جب  
 میں تنگی تلوار لے کر چلا۔“

فمرت کهاة ذات خیف جلاله  
 عقيلة شیخ کالو بیل یلندد  
 ”تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڑھے کی، جو ایک لٹھی کی طرح جھگڑا تو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔“  
 وقسال الاماذا ترون بشارب  
 شدید علینا بعینہ متعمد  
 ”(اور جب میں نے تلوار سے کوچ کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا) تو اس بڑھے نے کہا: اس بدست  
 کو دیکھو جو جان بوجھ کر ظلم کر رہا ہے۔“

فظل الاماء بمتلن حوارها  
 ویسعی علیها بالسدیف المسرهد

”تو لونڈیاں اوٹینکے بچہ کو (جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔“

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سب سے معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہے:

بل انت لا تدرین کم من لیلة  
”بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔“

قد بث سامرها وغایة تاجر  
”میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوشی کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔“

اغلی السباء بکل ادکن عائق  
”میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاک کی رنگ کی مشک یا نم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔“

وصبوح صافية وجذب کرینة  
”اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔“

بادرت حاجتها الدجاج بسحرة  
”میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہراؤں۔“

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخر یہ میں کہتا ہے:

الاهبی بصحنک فاصبحینا  
”ہاں اپنا پیالہ لیکر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین کے (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹے نہ پائے۔“

مشعشة کان الحوض فیها  
”پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔“

تعجور بذی اللبانة عن هواه  
”غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔“

شرح المعلقات، ص: ۱۰۹ وما بعد۔

ترى اللحز الشحيح اذا أمرت عليه لماله فيها مهينا  
”تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دو گز اردیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔“

صبنت الكأس عنام عمرو وكان الكأس مجراها اليمينا  
”اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دروازہ اپنی طرف تھا۔“

وما شر الثلاثة ام عمرو بصاحبك الذي لاتصحبينا  
”حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔“

كأس قد شربت ببعلبك واخرى فى دمشق وقاصرينا  
”اور ایک وہ پیالہ جس کو بعلبک میں پیادو رسراوہ جو دمشق اور قاصرین میں پیا۔“

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایہ کہتے تھے (دیکھو اوپر لہبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشوں کا مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمرہ کہتا ہے:

اذا سحب الریط والمروط الی ادنی تجاری وانفض اللمم  
”یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانے میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔“

بدر میں قریش کے جو دولت مند رؤسا مارے گئے تھے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے:

وما ذا بالقلب قلب بدر من القينات والشرب الكرام  
”بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناپنے والیوں اور فیاض شرایوں کا ماتم ہے۔“

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھالی سونا م ہیں اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعرا پر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبنت الكأس عنام عمرو وكان الكأس مجراها اليمينا۔

”اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم

شرح المعلمات السبع، ص: ۱۱۷، ۱۱۸۔ دیوان حماسہ، جزء الثانی، باب الادب: ۱۰۔

صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الهجرة واصحابه الى المدينة: ۳۹۲۔

سنی میں یہ سنا کرتا تھا: اسقینا کانساً دہافاً ”شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔“ ✽ صحیح بخاری کتاب الاثریۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس تھی جس میں حضرت ابودجانہ، ابوطلمہ رضی اللہ عنہما، سہیل بن بیضا شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ ✽

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوگا ✽ جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔ غزوہ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹ ملی تھی جس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر ازخرو (ایک گھاس کا نام) لائیں اور زرگردوں کے ہاتھ فروخت کریں اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹیوں کے کوبان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا یہ کام کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا:

الا یا حمز للشر ف النواء  
اے حمزہ! موٹی اونٹیوں کے لیے۔“

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی حضرت علی اور زید رضی اللہ عنہما کو لے کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ محمور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا: ”تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ۳۰ھ میں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا۔ کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اشاروں سے گزر کر جب تک صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاثریۃ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتادے۔“ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللهم بین لنا فی الخمر بیاناً شفاء۔ ✽

✽ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاہلیۃ: ۳۸۴۰۔ ✽ صحیح بخاری، کتاب الاثریۃ، باب نزول تحریم الخمر وہی من البسر والتمر: ۵۵۸۲، ۵۵۸۳۔ ✽ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة بدر: ۴۰۰۳۔ ✽ ابوداؤد، کتاب الاثریۃ، باب تحریم الخمر: ۳۶۷۰۔

”اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔“

اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت اتری:

﴿يَسْأَلُكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْفَعَةٌ لِلنَّاسِ وَإِنَّهُمَا آكْرَهٌ مِنْ

نَفْعِهِمَا﴾ (البقرہ: ۲۱۹)

”لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔“

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب **✽** نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ﴾ کی سورہ کو کچھ

**✽** شراب کی حرمت یہ تدریجی صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ مانند: ۳۰۴۹؛ ابو داؤد کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۵۹) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (ابو داؤد، کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابو داؤد کتاب الاشربة باب فی تحريم الخمر: ۳۶۷۱ کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب بن ابی عبدالرحمن ہے ابو عبدالرحمن سلمیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ میں وہ روایتیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے:

۱۔ ((عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوة فقد مونی ففرات قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ونحن تعبد ما تعبدون فانزل الله ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى﴾)) (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ نساء: ۳۰۲۶) ”ابو جعفر راہزی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمن سلمیٰ سے، ابو عبدالرحمن سلمیٰ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا تیار کر لیا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی، جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ﴾ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى﴾ (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)“

۲۔ ((عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب ان رجلا من الانصار دعاه وعبدالرحمن بن عوف فسقاهما قبل ان تحرم الخمر فامهم علی فی المغرب فقرا ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ﴾ فخلط فیها فنزلت ((لا تقربوا الصلوة وانتم سكارى حتى تعلموا ما تقولون)) (ابو داؤد، کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) (بقیہ حاشیہ کے صفحہ ۱۹۷ پر)

(۳) گزشتہ سے پوست) سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمن سلمیٰ سے، ابو عبد الرحمن سلمیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبد الرحمن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علی رضی اللہ عنہ نے نماز مغرب کی امامت کی اور قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گنہگار دیا اس پر آیت اتری ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ نئے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو، اس کو جان لو۔“

وہ روایتیں جن میں عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔

۳۔ ((حدثنا سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبد الرحمن بن عوف و صلی بهم المغرب فقرا قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ))  
فالتبس علیه فنزل ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى﴾)) (مستدرک حاکم الاشریہ، ج ۴، ص: ۱۴۲)  
”سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمن سلمیٰ سے، ابو عبد الرحمن سلمیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبد الرحمن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی، لیکن اس میں غلط ہو گیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى﴾ نئے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔“

۴۔ ((سفیان عن عطاء بن السائب عن ابن (۴) عبد الرحمن عن علی انه کان هو و عبد الرحمن و رجل آخر یشربون الخمر فضلی بهم عبد الرحمن بن عوف فقرا ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ فخلط فیها فنزلت ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾)) (مستدرک حاکم، کتاب الاشریہ، ج ۴، ص: ۱۴۲)  
”سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابن عبد الرحمن سے، ابن عبد الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبد الرحمن بن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبد الرحمن بن عوف نے نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾۔“

۵۔ ((خالد عن عبد الله عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن ان عبد الرحمن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبی ﷺ فیهم علی بن ابی طالب فقرا: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَعْبُدُوْنَ﴾ ونحن عابدون ما عبدتم فانزل الله عزوجل ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾ الاية)) (مستدرک حاکم، کتاب الاشریہ، ج ۴، ص: ۱۴۲)  
”خالد بن عبد اللہ، عطاء بن سائب سے، عطاء بن ابی عبد الرحمن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَعْبُدُوْنَ ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾ الاية۔“  
وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

۶۔ ((سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن عن علی قال دعانا رجل من الانصار قبل تحريم الخمر فحضرت صلوة المغرب فتقدم رجل فقراة ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ فالتبس علیه فنزلت ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾ الاية))۔ (مستدرک حاکم، تفسیر سور نساء، ج ۲، ص: ۳۰۷)  
”سفیان، عطاء بن سائب سے، عطاء، ابو عبد الرحمن سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلٰوةَ﴾ (الاية)۔“  
ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، دوسری اور چھٹی میں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر) (۳)

﴿﴾ گزشتہ سے پیوستہ) کہ دعویٰ کوئی انصاری تھے۔ چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی، پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے اور چھٹی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بیچین سے آنحضرت ﷺ کی محبت و تربیت میں پیل کر جو ان ہونے قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد ﴿قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ﴾ (کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبدالرحمن سلمیٰ جن کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرفدار حامی (شیعہ) تھا، بعد کو مثنیٰ (بنو امیہ کا طرف دار) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، (تہذیب التہذیب، ج ۵، ص: ۱۸۴) روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ شراب ہو گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گوسفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں، مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں (تہذیب التہذیب، ج ۷، ص: ۲۰۵) اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو غمخور تھے۔ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں خلط ملط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لیے یا تو ابو عبدالرحمن سلمیٰ عثمانی نے فرد قہاری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا ہی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷- (عن ابی ہریرۃ قال: حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول اللہ ﷺ المدینۃ و ہم یشربون الخمر

ویساکلون المیسر فسألوا رسول اللہ ﷺ عنہما فانزل اللہ علی نبیہ ﷺ: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ

وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ذُو اِثْمِهِمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الاية (۲/ البقرة: ۲۱۹) فقال الناس:

ما حرم علينا انما قال (فيهما اثم كبير) وکانوا یشربون الخمر حتی اذا کان یوم من الایام صلی رجل من

المہاجرین ام اصحابہ فی المغرب خلط فی قراءتہ فانزل اللہ فیہا ایۃ اغلظ منہا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا

تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ وکان الناس یشربون حتی یاتنی احدہم الصلوۃ

وہو سفیق ثم انزلت ایۃ اغلظ من ذلك: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ﴾ فقالوا التھنينا ربنا)) (مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۵۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو

لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت

نازل فرمائی: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَالْمَيْسِرُ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الاية

لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب بھی لوگ شراب پیتے رہے

یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قراءت میں خلط ملط کر دیا، اس لیے خدا نے شراب کے متعلق

اس سے زیادہ سخت آیت اتاری ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ اب

بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل

ہوئی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ﴾ اب لوگوں نے کہا کہ خداوند ہم باز آئے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا (بقیہ حاشیائے صفحہ ﴿﴾)



کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری:

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (٤/ النساء: ٤٣)

”نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔“

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی محمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔

لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی دعوت کی۔ اس میں شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر حکم آیا: ❁

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْكَارُ حَسْبٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ

فَأَجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (٥/ المائدة: ٩٠)

”اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان

سے بچو، تاکہ فلاح پاؤ۔“

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت حس وقت اتری حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امین ہذہ الامہ اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساتی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشراب میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی روایت ہے:

كنت اسقى ابا عبيدة و ابا طلحة و ابي بن كعب فجاء هم ات فقال: ان الخمر

حرام۔ ❁

﴿﴾ گزشتہ سے پورے کہیں ذکر نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں:

وفى هذا الحديث فائدة كثيرة وهى ان الخوارج تنسب هذا السكر وهذا القراءة الى امير المؤمنين على بن ابي طالب دون غيره وقد براه الله منها فانه راوى هذا الحديث (مستدرک تفسير سورة نساء، ج ٢، ص: ٣٠٧)

”اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قراءت کو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔“

در حقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صاحب واقعہ بنایا۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی فضل سعد بن ابی وقاص: ٦٢٣٨۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الاشراب، باب نزل تحريم الخمر: ٥٥٨٢۔

”میں، ابو عبیدہ ابی بن کعب اور ابوطلمحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔“  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ \* تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے پوچھ بچھ تک نہیں کی اور دفعۃً جام و سبوتوڑ ڈالے۔ یہ صرف ابوطلمحہ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔ بخاری باب المظالم میں ہے:

فجرت فی سبک المدینۃ۔ \* ”مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔“  
انندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

### قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا عام رواج ہو گیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اس لیے جو ابھی انہیں کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعتیرتنا البانها ولحومها      وذلك عار يا بن ریطة ظاهر  
”کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں، اے ابن ریطہ! ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔“

نحابی بها اكفاء نا ونهیننا      ونشرب فی اثمانها ونقامر  
”ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور انکو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جو ا کھیلتے ہیں۔“

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں فذ، توام، رقیب، جلس، مسبل، معلی، مناس، منیح، شیخ، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جو ا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جس کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو

\* فتح الباری، ج ۱، ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

\* صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب صب الخمر فی الطريق: ۲۴۶۴۔

مکڑے جمع ہوتے تھے ان کو فقیروں بچتا جوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخل خیال کرتے تھے اور ان کو ”برم“ کا خطاب دے رکھا تھا ❀ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے، ان سے شادی بیاہ کرنا تنگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بی بی کو وصیت کرتا ہے:

و اذا هلكت فلا تریدی عاجزاً  
عنسا ولا بسرما ولا معزالا

”اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں

قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔“

جوئے کی ایک صورت جس کو ”رہان“ کہتے تھے یہ تھی کہ شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لیے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہ ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنا پڑی۔ ❀ اور رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے۔ ❀ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بد مستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عیس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

www.KitaboSunnat.com

سود خوری

عرب میں سود خوری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں سوو کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبدیاسیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے، ہنومغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ❀

❀ یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر، ج ۲، ص ۳۳۱ میں ہے۔

❀ ترمذی، ابواب التفسیر، سورة الروم: ۳۱۹۴ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔

❀ تفسیر کبیر، ج ۲، ص ۳۳۱۔ ❀ تفسیر کبیر، ج ۲، ص ۵۴۰۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾

(۲/ البقرة: ۲۷۸)

”مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔“

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خوری نہ کریں گے۔ ❀ اسی طرح یمن کے نجرائی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ ❀

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے اور اس المال کے ادا کرنے کے لیے میعاد مقرر کر دیتے تھے جب میعاد گزر جاتی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سودور سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لیے کسی کو مثلاً: سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں اس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دو گنی چو گنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لیے نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۳۰)

”مسلمانو! دونا، چار گنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھی مثلاً: اگر راہن میعاد متعینہ پر مال مر ہو نہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا ❀ مال دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ ❀

لوٹ مار

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گراور راہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے تھے، جنہوں نے راہزنی کو اپنا بالکل ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے

❀ فتوح البلدان بلاذری فتح طائف، ص: ۶۳۔ ❀ ابو داؤد، کتاب الامارۃ، باب فی اخذ الجزیۃ: ۳۰۴۔

❀ مؤطا امام مالک، ص: ۳۰۴۔ ❀ بخاری، کتاب المغازی قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷۔

لوگوں کو ”لصوص“ کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔ یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پر زور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ ”وہ ون آئے گا کہ جب حیرہ سے ایک پر وہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی۔“ چونکہ وہ قبیلہ طے کے رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان میں سے سلامت نہیں گزر سکتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا۔ چنانچہ صبح کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لیے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا۔ کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور نخریہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

يا لهف زيا به للحوارث الصابح فالغانم فالاناب  
 ”اے زیا بہ کا افسوس حارث کے لیے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر سلامت واپس جانے والا ہے۔“

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لیے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج عام تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیم بن السلک اور تابطشتر شہرت عام رکھتے تھے، تابطشتر کا ایک قطع حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا

صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام: ۳۵۹۵۔

تھا، اس لیے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کبھی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا ❁ بلکہ اس کے لیے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔ ❁

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ ”وہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔“ ❁ بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ ❁ چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (بجن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ ❁

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ ❁

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لیے اس کے لیے غیر دبیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، بشر تین آدمی تھے، جن کو ”بنوایرق“ کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی جہو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاع نامی ایک شخص کے بالا خانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی لقب لگا کر چوری کی، آپ ﷺ نے رفاع کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاع نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جا ملا۔ ❁

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لیے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿وَلَا يَسْرِفْنَ﴾ (۶۰ / الممتحنہ: ۱۲) یعنی ”وہ چوری نہ کریں گی۔“ شرفاً اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے اس لیے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی،

❁ فتح الباری، ج ۱۲، ص: ۷۷۔ ❁ کتاب المعارف لابن قتیبہ، ص: ۵۵۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود كفارة: ۶۷۸۴۔ ❁ ۶۰ / الممتحنہ: ۱۲۔

❁ مسلم، کتاب الكسوف، باب ماعرض على النبي ﷺ في صلوة الكسوف من امر الجنة والنار: ۲۱۰۲۔

❁ بخاری، کتاب المناقب، باب ذكر اسلم وغفار ومزينة: ۳۵۱۶، مسلم، کتاب المناقب، باب من فضائل غفار واسلم وغفار: ۶۴۴۴۔ ❁ ترمذی، کتاب التفسیر سورة النساء: ۳۰۳۶۔

چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا، اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟“ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ”گزشتہ قومیں صرف اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔“ ❁

خود شہر کے اندر اس قسم کی واردات کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔“ ❁

سفا کی دے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت ماننے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پییں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سر پٹ دوڑا دیتے، اس کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور روسا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ کر مر جاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں ”صبر“ تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو ”بلیہ“ کہتے تھے۔

❁ بخاری، کتاب الحدود، باب کراہیۃ الشفاعة فی الحدود إذا رفع الی السلطان: ۶۷۸۸۔

❁ دار قطنی، کتاب الحدود والدیات، ۳/ ۲۰۴: ۳۴۳۰۔

## زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے۔ امرء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ، اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت کو بلا اعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں ❀ فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ❀ اور صاحب جاہداد کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام "عناق" تھا۔ مرشد غوثی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کر لوں۔ اس پر یہ آیت اتری: ❀

﴿وَالزَّانِيَةُ لَآ يَنْكِحُهَا الْاَزَّانُ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ (النور: ۳۰)

"اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔"

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کمالائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنو الیاء تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے۔ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری: ❀

﴿وَلَا تَكْذِبُوا فَاِنَّكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾ (النور: ۳۳)

"اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔"

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آ جائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے

❀ تفسیر طبری آیت: محصنت غیر مسافحت، ج ۵، ص ۱۳، مصر۔

❀ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا نکاح الا بولي: ۵۱۲۷۔

❀ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب قوله: الزانی لا ینکح الا زانیة: ۲۰۵۱۔

❀ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ ﴿وَلَا تَكْذِبُوا فَاِنَّكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾: ۷۵۵۳۔



پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنمتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نکاح الا بولی: ۵۱۲۷ میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔ ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔

### بے شرمی و بے حیائی

شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں:

اليوم يبدؤ بعضه اوكله فمابدا منه فلا اجله

”آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔“

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ❁

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ ❁

پانخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے ❁ جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے ❁ سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے بیوی بناتے۔

### عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے مترکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی

❁ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالى: ﴿خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾: ۷۵۵۱۔

❁ نسائی، کتاب الغسل، باب الاستتار عند الغسل: ۴۰۶۔ ❁ ابو داؤد، کتاب الطہارۃ، باب الاستبراء

من البول: ۲۱۔ ❁ ابو داؤد، کتاب النکاح، باب ما یکره من ذکر الرجل ما یکون من اصابته اہله: ۲۱۷۴۔

اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اشعار میں ادا کرتے۔ بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا۔ فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

فظلت وظلت یرکبون ہبیرھا ولیس لھم الا عوالیھا ستر

”تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔“

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ حرحان کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نکحت نساء ہم بغیر مہور ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔“

عمر و معد یکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمر و نے کہا:

امن ریحانۃ الداعی السميع کیار ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے۔“

یسور قنی واصحابی هجوع جس نے گو مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔“

اذالم تستطع امر افدعه اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر

وجاوزہ الی مانسطیع وہ کرو جو کر سکتے ہو۔“

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو ان کے عقد نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جانے خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں بیٹنی دی جاتی وہ بیٹنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی عورت کا جو مہر مقرر ہوتا

کتاب الاغانی، جزء ناسع، ص: ۱۲ اخبار درید بن الصمة۔

ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعنده نساء اکثر من اربع: ۲۲۴۱۔

ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب احدات المتوفی عنها زوجها: ۲۲۹۹۔

وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۚ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ ۗ أَيَسْئَلُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ ۝﴾ (النحل: ۵۸، ۵۹)

”اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کر لے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔“

ابوجزہ ایک رئیس تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار بڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی:

مالا بی حمزة لا ياتينا بييت في بيت اللتى تلينا  
”ابوجزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔“

غضبان الا نلد البنينا تالله ما ذاك بايدينا  
”اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے، خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔“

ونحن كما لزوع لزار عيننا ننبت ما قد زرعه فينا  
”ہم بطور رکھت کے ہیں، ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔“

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں واد کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔ ❁

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے۔ ❁ عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے دارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائزہ خولہ بن جاتی۔ ❁

وحشت و جہالت

حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے۔ حشرات الارض عام غذا تھی،

❁ تفسیر ابن جریر تفسیر سورہ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ جز ۳۰، ص: ۴۰؛ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورہ مذکورہ، جز ۴، ص: ۴۷۸۔ ❁ تفسیر ابن جریر، تفسیر ﴿يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي لُؤْلَائِكُمْ لِلذَّكْرِ مِنلُ حَظَّ الْاُنثَيْنِ﴾ جز ۴، ص: ۱۷۱۔ ❁ ایضاً، ص: ۱۹۲ تفسیر ﴿وَلَا تَعْضَلُوهُنَّ﴾

چھکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جمالیتے تھے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ ﴿۱﴾  
چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھالیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار  
کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے، ﴿۲﴾ گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ ﴿۳﴾

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشى، میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا اور اہل عرب نے  
آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں  
کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں:

واياك والسيتات لا تاكلنها ﴿۴﴾ ولا تاخذن سهما حذا لتفصدا

”مرداروں سے پرہیز کرو اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔“

وذا النصب المنسوب لا تنسكنه ولا تعبد الاوثان واللہ فاعبدا

”اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کرو اور نہ بتوں کی پوجا کرو اور اللہ کی عبادت کرو۔“

ولا السائل المحروم لا تتركه لعاقبة ولا الاسير المقيدا

”اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لیے مت چھوڑو اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے

قیدی کو۔“

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة ولا تحسبن المال للمرء مخردا

”اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کرو اور نہ کبھی یہ سمجھو کہ مال آدمی کے لیے ہمیشہ رہنے

والا ہے۔“

ولا تقربن جارة ان سرها عليك حرام فانكحن او تابدا

”اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کرو، وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر لے اور یا کنوارا رہ جا۔“

﴿۱﴾ اسباب النزول سیوطی آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ بر حاشیہ تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، ص: ۹۸۔

﴿۲﴾ تفسیر طبری، سورة مائدة بیان ماکولات۔

﴿۳﴾ صحیح نسائی، کتاب الصيد والذبائح، باب تحريم اكل لحوم الحمر الاھلية: ۴۳۴۵، ۴۳۴۶۔

﴿۴﴾ دیوان اعشى مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص: ۱۰۳ وشعراء النصرانية، قسم ثالث، ص: ۳۶۵۔

## عربوں کی خصوصیات

### خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی انہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

### صحتِ نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے۔ شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی، توراہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے، چنانچہ ریورنڈ فارنر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مؤرخ یوسفوس نے بھی یہی لکھا ہے \* اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفسون نے تاریخ البہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں \* اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لیے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے \* اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا:

﴿مِلَّةَ آبَائِكُمْ الَّتِي هَمَّتْ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸) ”تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرآن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو توراہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل و عیال کی نظر آتی ہے اسلام کے بعد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسوم و رواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر روزیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ کا حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

\* ترجمہ انگریزی ۱۸۴۴ء جلد اول ص: ۲۵۔ \* تاریخ البہود فی بلاد العرب لا اسرائیل ولفسون مطبوعہ مطبعة الاعتماد مصر، ص: ۷۵، ۷۶۔ \* سینٹ پال گلیٹون کے نام باب ۲-۲۵ کتاب العہد نجد، ص: ۵۸۱۔

”اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریٹرا اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔“

اہل عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے محفوظ رکھتے تھے قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعایاں تھی اور خدا نے ان کی نسل میں دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔ کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات و اخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً: وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ جو حیمت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام ”دین صغی“ رکھتے تھے اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ”الذہن سامیہ“ میں نے ارض القرآن، جلد اول، ص: ۱۰۷ سے ص: ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے کیجا کر دیے ہیں۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و بر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنے حرص و آرزو کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے جھرمٹ کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرت الہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام و انتظام اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جا برا نہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد پر باند نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفہ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ نا آشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے وہ اُمی تھے، تاکہ ایک اُمی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار رہیں۔ وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لیے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر، ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا، اور چین تک ان کا گزر ہوا، اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کی جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا با آسانی ممکن ہو۔

## بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاہد، نمونہ اور صلح بننے کے لیے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمیعتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پر جوش تھے

ساتھ ہی وہ پر جوش بھی تھے اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا یا ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزمِ راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا اور نہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ عقل و دانش سے وہ کافی طور بہرہ مند تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، خالد، ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجائی کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی تمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقررروں کی تقریریں، ان کے فصحا کے مقولے سب تو ان کی اس فطری صلاحیت کا



اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قوی بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قوی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں ان کے بعض قوی بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خو اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو بزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ انہیں کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہل عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں لڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات و زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہ ہوئے تھے اور نہ وہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لیے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں میسوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سب سے متعلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے۔ اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلائے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے

اہل عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایمان اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون و چرا اور کیسے، کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چندا چھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فورا عمل بن جاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے اسی بنا پر شارع ﷺ نے ان کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور در دور سے ہدیٰ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے بغیر فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی اور دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہل عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے پاک و مبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق اور شمال و جنوب میں اسلام کا پھر پرا آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے ان کے لیے چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آ پہنچے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیے خزانہ وغیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں اور نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے ہاتھ میں سپرد کی، آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام

کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو۔” ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے ان تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں میں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصے میں یعنی عرب میں بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔“ ❁

❁ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ: ۵۹۳۸، جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۵، ۳۶۰۶۔  
❁ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۷۔

## صبح سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کا نور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پر نور ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گودنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے اُفق سے تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی زمین روشن ہو۔

### ایک قوم کا انتخاب

سرور کائنات ﷺ کو گودخانے تمام عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو، وہ جس کی ہر بات، ہر ادب، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتم الانبیاء ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا ﴿ دینا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے ﴿ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (۲/ البقرہ: ۱۷۷) ”ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی۔“ کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کرتی تھی اور فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن حنیٰ زمین کی طرح مادہ ہائے نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا مشیت ایزدی نے اسی کوتا کا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا ﴿ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجْتُمْ لِیَلْمِیْنَکُمْ بِاَلْمَعْرُوفِ وَتَکْفُرُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۰) ”تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے (پردہِ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔“ کا مظہر بن گیا۔

﴿ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جوینہر تمام عالم کے لیے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اہم مذہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

یدعو قومنا الی السنۃ الراشدۃ ویزکیہم ویصلح شانہم ثم یتخذہم بمنزلۃ جوارحہ فیجاہد اہل الارض ویفرقہم فی البلاد وهو قولہ تعالیٰ: ﴿ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجْتُمْ لِیَلْمِیْنَکُمْ بِاَلْمَعْرُوفِ وَتَکْفُرُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ﴾

(حجة الله البالغة، ص: ۱۲۳ مطبوعہ ہند)

”وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے، پھر ان کو اپنا دست و بازو دیتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعے سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔“

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَتَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَتَوْا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الحج: ۴۱)

”وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔“

### اصلاح و ہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گونا گوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جو رو ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے ہتھیار سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت سلطنت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خداداد نونوں جا کر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مرکر مقرر نہیں ہو گئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

### جہالت

عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاو، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے ان کے کان آ سنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کے اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

﴿يَسَّ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۗ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۗ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۗ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۗ﴾ (۳۶/یس: ۶۱)

”قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے، تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔“

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

﴿وَعَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هَذَا سِحْرٌ كَذٰبٌ ۗ أَجْعَلِ الْاٰلِهَةَ الْهٰٓءِٓ وَاحِدًا ۗ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ ۝ وَاَنْطَلَقَ الْهٰٓءِٓ مِنْهُمْ اِيْنَ اَمْشُوْا وَاَصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۗ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَظِيْمٌ ۗ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِى الْاٰخِرَةِ ۗ اِنَّ هٰذَا اِلَّا اَخْتِلَاقٌ ۝﴾

(۷۰/۳۸ ص: ۴-۷)

”اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو، جادوگر ہے اس نے اتنے خداؤں کا ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے سچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جتھے رہو، اس میں اس کی پیغمبری کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔“

﴿بَلْ عَجَبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝﴾

(۲/۵۰ ق: ۲)

”بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا: یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔“

صفاتِ الہی، آثارِ نبوت، احوالِ معادان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سر تا پا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا لَوْ لَآ اَنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ ۝﴾ (۲۵/ الفرقان: ۲۱)

”اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔“

﴿اِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ ۗ قَالُوْا لَوْ شَاءَ رَبِّنَا لَآ اَنْزِلَ عَلَيْنَا مَلٰٓئِكَةٌ ۗ فَاِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ لَكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (۴۱/ حم السجدة: ۱۴)

”پیغمبر جب ان کے سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو، تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔“

﴿وَمَا مَنَّ اللّٰهُ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى ۗ اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۗ قُلْ لَوْ كٰنَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَرْنٰهُمْ عَلَيْنِهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ ۗ مَلٰٓئِكًا رَّسُوْلًا ۝﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۵)

”ہدایت آنے کے بعد صرف اس شہد نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے

آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جو اب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔“  
نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراء صورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پر اہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں:

﴿ وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَنْزِلَ لَنَا مِنَ السَّمَاءِ آيَةٌ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن تَحْتِهَا يُسْقَىٰ مِنْهَا نَهْرٌ فَلْيَنْزِلْ لَنَا نَهْرٌ مِّن سَمَاءٍ آخَرَ أَوْ تُسْقَطَ السَّمَاءُ كَمَا زَعَمْتُمْ عَلَيْنَا كَيْفَ أَوْ تَأْتِي بِنَبَأٍ مَّا نَحْنُ بِرَآئِيهِ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكَ حَافِظًا مِّن سَمَاءٍ مَّا نَرَىٰ رِيسًا وَلَا نَحْمِلُ فِيهِ ثِقَلًا ۗ ﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۰، ۹۳)

”انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لیے تو چشمہ نہ بہا دے، یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو، جن میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے، یا خدا اور فرشتوں کو پرانا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھرنہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔“

﴿ وَقَالُوا مَا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَسْئَلُ فِي الْأَسْوَاقِ كَلَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ۗ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كِتَابٌ أَوْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۗ ﴾

(۲۵/ الفرقان: ۷، ۸)

”انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترتا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا۔“

پیغمبر کے لیے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میوؤں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لیے مکہ اور طائف کے جور و سادولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِيِّينَ عَظِيمٍ ۗ ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۳۱)

”وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترتا۔“  
کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی

لکھا کی ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے جمع میں اتر آئے:

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْكَ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ﴾ (٢٥ / الفرقان: ٣٢)

”کافروں نے کہا، اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اتر۔“

﴿ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِيَوْمِكَ حَتَّىٰ نُنزَلَ عَلَيْكَ كِتَابًا نَقْرُوهُ ﴾ (١٧ / بنی اسرائیل: ٩٣)

”اور کافروں نے کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں

ہوں گے، جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔“

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَابٍ فَلَسَوْهَ بِأَيْدِيهِمْ لَعَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا

سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾ (٦ / الانعام: ٧)

”اور اگر کاغذوں میں لکھا ہوا کوئی قرآن آسمان سے تم پر اترے جس کو تم اپنے ہاتھ سے منول

بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ الوہیت اور صفاتِ الہی کے اسرار، نبوت

کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لیے حیرت اور استعجاب کا سرمایہ تھی:

﴿ أَفَأَكْفُرُ بِدَبْرِهِمْ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّا نَكْفُرُ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴾ (٢٣ / المؤمنون: ٦٨، ٦٩)

”کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے

پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔“

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی

اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی وہ

سر تا پایلیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا خنفا کے آغوش

پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلامِ الہی کا جواب خندہ تحقیر سے دیتے تھے اور

رموز نبوت کے دانا جسم پر غم اور دل پر کیف تھے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا بُعِثَ عَلَيْهِمْ بَحْرُونَ لِلَّذِقَانِ سَجْدًا وَيَقُولُونَ

سُبْحٰنَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿١٧﴾ وَيَحْزُونَ لِلَّذِقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿١٨﴾

(١٧ / بنی اسرائیل: ١٠٧، ١٠٩)

”جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی

ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گڑ پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے



(ایک پیغمبر آخر الزمان بھیجے گا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رکو وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔“

﴿وَلْتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةَ الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِي ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَسِيصِينَ وَرَهَابًا ۖ وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝﴾

(۵/ المائدة: ۸۲، ۸۳)

”ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کونصاروں کو کہتے ہیں، سبب یہی ہے کہ ان میں قسیصین اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا! ہم ایمان لائے، ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔“

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، تاہم چشم دل کو تینش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے:

﴿الَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ط وَإِنَّ قَرِيْبًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝﴾ (۲/ البقرة: ۱۴۶)

”جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔“

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۖ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۖ﴾ (۲/ البقرة: ۸۹)

”اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔“

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لیبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہوں کا جو یاں ہے، حضرت سعید بن زید، عثمان بن مظعون، صہیب رومی، ابوذر غفاری، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے۔ ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین خدا کا کلام

تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورنہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک ترین (۵۳) برس تک آپ کے چہرہ پر نور کو دیکھتے رہے لیکن نور الہی کو نہ پہچان سکے اور عبد اللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پر نور کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی بجلی ہے۔ رؤسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے، نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہر قل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھریہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جو ان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اسی دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھالے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں، لیکن بیثرب، ہجر، یمن، عمان، بحرین کے بڑے بڑے عیسائی اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کس قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعۃً مسلمان تھے۔

### آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر بنی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں۔ دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع اور وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس منادیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراہ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں دسین ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے ان کے شعر و شاعری اور فخر و مہابات کا سب سے پر جوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی آباءِ دین کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دینِ جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَنبَغُ مَا أَفْقَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ

أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (٢/ البقرة: ١٧٠)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں (تب بھی)۔“

﴿بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ الْآبَاءِ نَحْنُ

قَبِيْلِكَ فِي قَرِيْبٍ مِّنْ تَذْوِيْرٍ إِلَّا قَالِ مُتْرَفُوْهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ الْآبَاءِ

مُقْتَدُونَ﴾ (٤٣/ الزخرف: ٢٢-٢٤)

”بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر راہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر! کیا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم انہیں کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو (جو دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔“

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَنبَغُ مَا أَفْقَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ

أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (٧/ الاعراف: ٢٨)

”اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔“

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

أَبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور اس کے رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے، وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)“

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّبِينٍ ۗ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَنْبَغُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ كُفَّانَ الشَّيْطَانُ يَذَّوَّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ سَعِيرٍ ۝﴾ (لقمان: ۲۰، ۲۱)

”کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)“

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کو چھوڑنا کس درجہ مجال نظر آتا تھا، آپ ﷺ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر بلبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کیے وہ یہ تھے ”اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم ان کو روکو، یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔“

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا۔ ابوطالب نے ان کو سمجھا بھجا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا ”اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم! ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی جھوٹیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔“ اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ”اے ابوطالب! اولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جو ان ہے تم اس کو متہنی بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔“ سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں

نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا: ”اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی، ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا غرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔“ ❁

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے۔ موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اکثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ ”لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔“ ❁

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے، نتیجے نے بار بار کہا: ”چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔“ ابوطالب نے جواب دیا: ”جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ”چچا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔“ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا: ”ابوطالب! کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔“ آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ ”میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔“ اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، ❁ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ ”اے بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔“ ❁ ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ سے وہ فقرہ کہہ دیا ❁ بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ پر زور اور پراثر دلیل نہ تھی کہ ”ابوطالب! کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟“ ان سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

❁ یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں تفصیل مذکور ہیں۔ ملا دنا ہوں سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۵۲۔

❁ مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۱۵۰ کتاب الایمان۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا قال المشرك عند الموت لا اله الا الله: ۱۳۶۰۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی صحة الاسلام من حضرہ الموت..... الخ: ۱۳۵۔ ❁ ابن ہشام وفات ابی طالب، ذکر الاسراء والمعراج، ج ۱، ص: ۲۵۲۔

تو ہم پرستی

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو پلٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزند زینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں نمودنے کہا:

﴿إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ﴾ ﴿١١/ ٥٤﴾

”ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتائے تم کو آ کر ستایا ہے۔“

ابتدا میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا۔ جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے تہاڑ پھونک کر آئے۔ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہما ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزریٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ”ضمام! ان کو براندہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔“ حضرت زینرہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا ”لات و عزریٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔“ حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ”دیکھو واد الشری (بت) کہیں بر باد نہ کر دے۔“ فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزریٰ، منات، ذبی اللکھین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے۔ خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا۔ پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔

ابن کثیر تفسیر سورۃ ہود، (آیت مذکورہ ج ۲، ص ۴۳۹) رخصری، ۸، ص ۶۱۷؛ ابن حبان، ج ۵، ص ۳۳، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۴۰۳ تفسیر آیت ﴿مَا لَكَ بِبِعْبَادَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ ﴿٥﴾ و نیز ﴿مَا بَصَابِحِهِمْ مِنْ جَنَّةٍ﴾ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف الصلوة والخطبة: ۲۰۸۔ صحیح مسلم، باب تخفيف الصلوة والخطبة: ۲۰۸۔ دارمی، کتاب الصلوة، باب فرض الوضوء والصلوة: ۶۵۲۔ اسد الغابہ، ترجمہ حضرت زینرہ، ج ۵، ص ۴۶۲ و سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین علی المستضعفین، ج ۱، ص ۱۹۵۔ اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسی، ج ۲، ص ۵۴؛ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۳۳۔ ابن سعد جز ثانی، قسم اول، ص ۹۹؛ طبری ذکر ہدم اصنام، ج ۲، ص ۱۶۴۸۔

تو ہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن تو انہیں گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلم، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معنایہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعۃً وہ متزلزل ہو جاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے: ❁

كان الرجل يقدم المدينة فيسلم فان ولدت امرأته غلاما ومنتجت خيله قال هذا دين صالح وان لم تلد امرأته ولم تنتج خيله قال هذا دين سوء۔

”باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنمتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ نہایت برا مذہب ہے۔“

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی: ❁

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۚ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ ۗ﴾ (الحج: ۱۱)

”اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچے تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر بتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً رو برگشتہ ہو جاتے ہیں۔“

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے تو اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔ ❁ سوئے اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا اس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں حضرت ابو بکر و حضرت بلال رضی اللہ عنہما آئے تو سخت بیمار ہو گئے ❁ حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی ❁ اگرچہ مخلصین ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگوار یوں کا کوئی اثر نہیں پر سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے سبے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکلم و عمرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقیت کے

❁ تفسیر سورۃ الحج: ۴۷۴۲۔ ❁ ایضاً۔

❁ مستدرک حاکم، ج ۳، ص: ۵۴۸ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر، ج ۴، ص: ۶۹۔

❁ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عیادۃ النساء الرجال: ۵۶۵۴ و باب مقدم النبی ﷺ المدینہ: ۳۹۲۶۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان قاتل نفسه لا یکفر: ۳۱۱۔

سب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب دہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے ❀ اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوئے اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ﷺ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، تو آپ نے ﷺ فرمایا: ❀

((المدینة کالکبیر تنفی خبثها وتنصع طیبها))

”مدینہ آگ کی بھی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جو ہر کو خالص کر دیتا ہے۔“

انہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

((اللہم حبب الینا المدینة کحبنا مکة او اشد اللہم وصححها وبارک لنا فی

مدھا وصاعها وانقل حماھا فاجعلھا بالجحفة)) ❀

”خداوند مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح

کردے اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جھم میں منتقل کر دے۔“

### قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا ثنا قریباً محال تھا، انہی لڑائیوں نے غار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لیے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ”غار“ کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لیے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ”غار“ ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاویہ زور و قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لیے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، ہنوا میہ کی مخالفت اس کے لیے لاجمال ہوتی تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو

❀ صحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب لم یسق المرتدون المحاربون حتی ماتوا: ۶۸۰۴۔

❀ صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینة، باب المدینة تنفی الخبث: ۱۸۸۲ و باب اعتصام السنة: ۷۳۲۲۔

❀ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ المدینة: ۳۹۲۶۔



گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمد تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لیے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ ❁

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی۔ خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو کہ انصار اسلام لا کر ہمد تن نیکو کاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعثت کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں ❁ اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ الفک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں، اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجلاؤں گا، اس پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے، دفعۃً کھڑے ہو گئے اور کہا:

كذبت لعمر اللہ لا تقتله ولا تقدر علی قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل۔

”خدا کی قسم! تو جھوٹ کہتا ہے، تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔“

اس بر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث الفک میں ہے:

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هموا ان يقتلوا ورسول الله قائم على المنبر ❁۔  
 ”پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔“

❁ ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ عرض رسول اللہ ﷺ بنفسه علی القبايل، ج ۱ ص: ۲۶۱۔ ❁ اصحابہ تذکرہ اوس بن قطیبی، ج ۱، ص: ۸۸؛ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اس قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبد اللہ، ص: ۱۲۳۔  
 ❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الفک: ۱۶۱۔

ایک بار محکم بن جسامہ لیشی نے عبد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور قارع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بات بڑھی اور سخت شور و غضب ہوا تو آپ ﷺ نے عیینہ سے فرمایا: ”دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے؟“ اس نے کہا: ”خدا کی قسم! اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستاؤں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے۔“ اس پر شور و غل ہوا آپ نے پھر یہی الفاظ دہرائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لیے قبیلہ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدمک کے بھاگ گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لیے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر ۵ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ \* اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلوار کو میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لیے اس کو ڈھونڈ رہے تھے سوئے اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فورا قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ نبوت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابو بکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

”خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیے اس کو میرے لیے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حد و حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا تاہم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔“

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔ \*

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ اسلام لاکر

\* ابو داؤد، کتاب الدیات، باب الامام یا مر بالعضو فی الدم: ۴۵۰۳۔

\* مسند امام احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۳۱۔

جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری نے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوائیے، آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ((الا لا یسجنی والد علی ولده)) یعنی ”لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔“

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تارک کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا انصاری نے یا لانا انصار (انصاری کی وہابی) پکارا، مہاجر نے بھی یا لانا مہاجرین (مہاجرین کی وہابی) کا نعرہ مارا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ ”یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔“

((ما بال دعوی الجاهلیة)) ❁ ”یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔“

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے اس لیے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا۔ عمرو بن اُمیہ ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی۔ ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وكان له ثار في الجاهلية وكره ان يسلم حتى يأخذه. ❁  
”ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔“

اسی طرح حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ ❁

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندی رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی،

❁ دارقطنی، کتاب البیوع، ۳/ ۴۴: ۲۹۵۷۔

❁ صحیح بخاری، کتاب المناقب باب ما نبی من دعوی الجاهلیة: ۳۵۱۸۔

❁ اسد الغابہ، ج ۴، ص: ۸۵۔ ❁ اصباہ فی تمییز الصحابة ذکر عمرو و بن مالک، ج ۲، ص: ۱۳۔

تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پہلے ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے خاندان بھی تھے وہ بھی حرم کے مناصب دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فائدہ اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے ابو جہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ ”محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے“ تو اس نے صاف کہا کہ ”میں کیا کہوں محمد ﷺ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان سے دعوتیں دیں، انہوں نے خون بہا دیے ہم نے بھی خون بہا دیے، انہوں نے زرا پاشیاں کیں ہم نے نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعۃً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں، خدا کی قسم! ہم کبھی محمد ﷺ پر ایمان نہیں لا سکتے۔“ یہی ابو جہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشف کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ ❁

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حراء، الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثلاً: غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے، انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے ❁ خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لیے آتا تھا اور آستانہ کعبہ پر سر جھکا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و چشم غرض ریاست و امارت کے تمام تر سر و سامان رکھتے تھے، اس لیے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت، صرف قریش کی متابعت پر محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام روسائے قبائل کو پہنچتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور

❁ ابن ہشام، حصہ اول، ص: ۱۹۲ اسلام حمزہ۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل: ۲۹۶۲، ۲۹۶۳، ۴۰۲۰۔ ❁ طبری واقعہ خیبر، ج ۳، ص: ۱۰۷۵۔

مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو ”مربع“ کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آ جاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام ”صفی“ تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصلہ ہوتے تھے۔ یہ رؤساء عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔ قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لیے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج سے عقبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصاران کے مقابلہ کو نکلے تو عقبہ نے اس بنا پر اس کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جو نہیں۔ ❁

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبکہ بنو الاہبم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبکہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبکہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا، اس کا کیا قصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبکہ نے کہا یہ میرا تہہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبکہ نے کہا: جو مذہب شرفاً کو ذلیل کر دیتا ہے، میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔ ❁

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبکہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک ہی درجہ تھا اس لیے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تہا اچارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از باہم کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قرظہ، بنی نضیر، بنی قیقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیماء، وادی القرئی وغیرہ کے

❁ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی المبارزۃ: ۲۶۶۵۔

❁ فتوح البلدان بلاذری، ص: ۱۲۴؛ دروس التاریخ، ج ۲، ص: ۹۰۔

یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجرین اور قلعہ نشینوں سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کیے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران و روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہیں دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لیے اس ملک میں اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہ آ سکتا تھا اس لیے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دادرگاہی کرنی چاہی کسریٰ ایران نے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کر دے قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

### ذریعہ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا۔ اور پرہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینے تک جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔ اندرونی عرب تمام تر دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لیے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء، چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بخارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت ﷺ نے دو مہاجرین پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا دو مہاجرین مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظہ ما تقدم کے لیے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔ \* حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

\* ابن سعد، جز ثانی، قسم اول، ص: ۴۴؛ زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۷۰۔

((اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منه في شيء)) ❁

”اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔“

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے، ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ”چوری نہ کریں گے“ ❁ اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے تو بہ کرنا ہوتا تھا اس لیے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود ہزن اور غارت گرنہ تھے وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لیے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو ذریعہ یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ”الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح“ (صفحہ ۱۳۸ جلد ۲) میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے لکھتے ہیں:

قال الشافعی کانت قریش تتاب الشام انتیباً کثیراً وکان کثیر من معاشها منه وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرک للنبی ﷺ خوفها من انقطاع معاشها بالتجارة من الشام والعراق اذ فارقت الکفر ودخلت فی الاسلام وخلاف ملک الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی ﷺ ((اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده فلم يبق بارض العراق كسرى يثبت له امر بعده)) وقال: ((اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده فلم يكن بارض الشام قيصر فاجابهم على ما قالوا))

”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمدورفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع

❁ صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد.....: ۲۷۳۱۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب توبۃ السارق: ۶۸۰۱۔

معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہ ہوا، جس کی وہاں حکومت ہو۔“ اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔“

### رفع شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعداد و ازواج اور سرساری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعداد و ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوتے رہتے تھے جہاد کے لیے اور بہت سی پابندیاں تھیں، جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے اور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھی ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لیے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس شاد ہاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ، جہالت، عادات رسوم اور نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔ ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہے، وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے، لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم



تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا تاہم یعنی انتقام خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا۔ خاندانی فخر و مہابت ان کی قومی زندگی کی روح تھی، فنا کر دی گئی۔ ابوسفیان رئیس العرب کو بلال رضی اللہ عنہ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھر میں آگئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے، سرد پڑ گئے۔ اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گھلے کا بار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی:

﴿وَأَنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ (البقرة: ۴۵)

”اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔“

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب وہ حج جاہلیت کا حج نہیں رہا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی۔ بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے۔ مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور ادا کر کا حال تھا اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جابلانہ خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ وعود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو! تمام مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گاہاں اور ادائیگی ہے، پارسیوں میں زمرہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے ولفریب بت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلاویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سرو پا ہے کہ اسلام اس لیے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔ پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

## تبلیغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ مواعظ، عواقد، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لیے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل \* کے بقول نسبتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

## فریضہ تبلیغ

”تبلیغ“ کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا دعوت جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تزکیہ جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت۔ باقی زیادہ تر ایسے تھے جو تبلیغی نہیں تھے، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قوموں میں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی)

\* ہیر و زاینڈ ہیر و ورشپ (محمد ﷺ)

(۱۵) یا یونانی (مقرس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا: ”میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔“ (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا: ”مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔“ (۲۷) پھر فرمایا: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔“ (متی ۶) پھر ارشاد فرمایا: ”وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔“ (متی ۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

### تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لاکھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لیے اپنی تبلیغ کے لیے قریش، وغیرہ قریش جاز و بہن، عرب و عجم، ہندوروم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الہی کا پہنچانا فرض قرار دیا ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ قُمْ فَأَنذِرْ ۗ﴾ (۷۴/ المدثر: ۱، ۲) ”اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہوا اور ہشیار و آگاہ کر“ پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿يَلْغَمَ مَا أَنزَلَ إِلَيْكَ﴾ (۵/ المائدہ: ۶۷) ”جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا“ ﴿فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (۴۲/ الشوری: ۱۵) ”لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔“ ﴿فَذَكِّرْ لَنْ نَقَعَتِ الذِّكْرَىٰ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ: ۹) ”لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔“ ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۵) ”اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔“ ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مِنْ مِّنْ يَّخَافُ وَعَيْدٍ﴾ (۵۰/ ق: ۴۵) ”قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔“ اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔“

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تو اوصی بالحق

صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام: ۲۹۴۲؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل -

الصحابیہ، باب من فضائل علی: ۶۲۲۳۔

یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکلانے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الہی لوگوں تک پہنچائیے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ﴾ (۵/ المائدہ: ۶۷)

”اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا، تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔“

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغامِ الہی، سچائی کا ایک بہت چستہ ہے، جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۲۱۴)

”اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔“

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

﴿لَتَنْذِرْنَا أَمْ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (۷/ الشوری: ۴۲)

”تا کہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدوی ہیں ان کو آگاہ و ہشیار کرے۔“

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی مجھ بوجھ، احساس و عقل وغیرہ

حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۗ لِيُذَيِّرَ مَنْ كَانَ حَيًّا﴾ (۳۶/ یسن: ۶۹، ۷۰)

”یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے، تا کہ وہ اس کو ہشیار کرے

جو زندہ ہے۔“

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

﴿لَا تُذِرْكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (۱۹/ الانعام: ۱۹)

”تا کہ میں تمہیں آگاہ و ہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔“

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے:

﴿ هَذَا بَلَّغُ النَّاسِ ﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۵۲)

”یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے۔“

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ﴾ (۳۴ / سبأ: ۲۸)

”اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا۔“

آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمادیں:

﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾ (۷ / الاعراف: ۱۵۸)

”اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔“

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۗ الَّذِي لَهُ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ

وَالْأَرْضِ ۗ ﴾ (۲۵ / الفرقان: ۱، ۲)

”برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ)

پر نازل کی، تاکہ وہ دنیا جہان کے لیے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو وہ خدا جس کی ملکیت میں

آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔“

اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری بھی اس وقت

دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

﴿ إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۗ وَكَتَعَمَّرْنَا نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۗ ﴾ (۳۸ / ص: ۸۷-۸۸)

”یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔“

انبیاء اور بانیاں مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے

گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے

علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری

قوم کو نہ اپنا و نہ عطا سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی

زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لیے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش گوبرسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدا رہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتح مبین قرار دیا اور ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ (۴۸/ الفتح: ۱) نازل ہوا، اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ و قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امرا اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دہلیم، ایران، حبش اور روم کے طاہرین اسلام لائے اور فیضان حق سے سیراب ہوئے مشرکین عرب، یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی، لیکن نفس تبلیغ کی فریضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

### تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کس سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفہ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

﴿أَدْعُرَآئِي سَبِيلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط﴾

(۱۶/ النحل: ۱۲۵)

”اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے

مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔“

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے عقل و حکمت، موعظہ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان مستحکموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیاں جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیل لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات ہیں جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے

صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسریر، باب صلح الحدیبیہ: ۴۶۳۷۔

جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین میں مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت اور دوسرے کو موعظت حسنه اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کو قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشین و لیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت اور دوسرے کا نام موعظت حسنه اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔ تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

### قول لیلین

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن کو بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰی ۗ فَقَوْلَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۝﴾

(۲۰/طہ: ۴۳، ۴۴)

”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔“

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور داعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعی و مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاحظت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

### اعراض اور قول تبلیغ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے

تھے یہ حکم ہوتا ہے:

﴿فَاعْوِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا﴾ (٤/ النساء: ٦٣)

”تو ان سے درگزر کر اور ان کو یہ نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔“

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں

اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلطنتی، بدتہذیبی اور درشتی سے ان کو درگزر اور برداشت کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ((بَشِيرًا وَلَا تَعْسِرًا وَبَشِيرًا وَلَا تَنْفِرًا)) ﴿١﴾ ”دین الہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔“ یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنوا صداؤں سے دلوں کو پر امید اور مسرور بنانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

مدرج

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد ﷺ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو

صحیح بخاری، کتاب المغازی، بعث ابی موسیٰ ومعاذ الی الیمن قبل حجة الوداع: ٤٣٤١، ٤٣٤٢۔



ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بہترین مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ ❁

### تالیف قلب

تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ کو بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿وَالْمَوْلَانَةَ قُلُوبَهُمْ﴾ (۹/توبہ: ۶۰) اس کے لفظی معنی ہیں ”دلوں کو ملانا“ اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا، بھولطف و محبت اور امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے، یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبول حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال انہیں کو تقسیم کر دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوان جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ”مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا، جتنا دیا اور مجھے ان سے سخت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔“ ❁ ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں وہ مجھ کو عنایت کیجئے، آپ ﷺ نے وہ سب اس کو دے دیے یہ فیاضی دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آ کر کہا: ”بھائیو! اسلام قبول کرو کہ محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔“ ❁

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سر ہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ ”اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔“ ❁

### دعوت عقل

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو، کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر

❁ صحیح بخاری، باب مذکور: ۴۳۴۷۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخاۃ ﷺ: ۶۰۲۲۔

❁ ایضاً: ۶۰۲۰۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا سلم الصبی ... الخ: ۱۳۵۶۔

مذہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیہ ﷺ یہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراة) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبی مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار نیا نیا لفظوں کو آیاتِ الہی میں غور و فکر کی ہدایت کی۔ فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ﴾ ﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (۶/ الانعام: ۱۴۸-۱۴۹)

”کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو انکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔“

نیز ارشاد ہوا:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْهَلَاكِ عَنْ بَيِّنَةٍ وَبِحَيْبِي مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

(۸/ الانفال: ۴۲)

”تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو حیات ہے وہ دلیل سے جیتے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔“

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَعْزُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ﴾

(۱۲/ یوسف: ۱۰۵)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔“

غور و فکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ

يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقَعُودًا وَأَعْلَىٰ جُؤْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا

مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

”بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے

نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اپنی کردوٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ

میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ (عالم) بیکار نہیں بنایا۔“

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی

استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

﴿وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾ (الذاریات: ۲۱)

”اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔“

صحیفہ محمدی ﷺ کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿تَبْصِرَةً وَذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ﴾ (۵۰/ق: ۸)

”یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لیے۔“

﴿هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (۷/الاعراف: ۲۰۳)

”یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔“

﴿هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ﴾ (۴۵/الجاثیہ: ۲۰)

”یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔“

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾ (۴/النساء: ۸۲)

”کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔“

﴿وَالْقُرْآنَ الْحَكِيمَ﴾ (۳۶/یس: ۲)

”حکمت والے قرآن کی قسم۔“

﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾ (۱۰/یونس: ۱، ۳۱/لقمان: ۲)

”یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔“

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزاء، سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر درود یوار سے آتی ہے، لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان، مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بے زور پیدا نہیں کر

سکتی، بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔“ فرمایا:

﴿لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ مَنْ كَذَّبَ بَيْنَ الرَّشْدِ مِنَ النَّعْيِ﴾ (٢/ البقرة: ٢٥٦)

”دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔“

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی۔  
دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾

(١٨/ الكهف: ٢٩)

”اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔“

ایمان اور کفر ان دو میں سے کسی ایک کو اختیار پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نا فہم اس سے محروم رہیں گے اس لیے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی منوانا نہیں:

﴿أَكْمَأَعْلَىٰ رَسُولُنَا الْبَلَّغُ الْعَمِيمُ﴾ (٥/ المائدة: ٩٢)

”ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔“  
آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے، تسکین دی گئی:

﴿إِنَّ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَّغُ﴾ (٤٢/ الشوری: ٤٨)

”اے پیغمبر ﷺ تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔“

﴿إِنَّمَا أَنْتَ مَذْكُورٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُضَيِّطٍ﴾ (٨٨/ الغاشية: ٢١، ٢٢)

”اے پیغمبر ﷺ! تو، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر درار و غم بنا کر نہیں بھیجا گیا۔“

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۗ إِنَّ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَّغُ﴾

(٤٢/ شوری: ٤٨)

”پھر اگر وہ (اسلام کی دعوت سے) انکار کریں تو اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔“

کسی دین کو زبردستی پھیلا نا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ بِيَعَا ۗ أَفَأَنْتَ تَكْفُرُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا

مُؤْمِنِينَ ﴿١٠﴾ (یونس: ۹۹)

”اور اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے، تو کیا اے پیغمبر ﷺ تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔“

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَةَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾﴾ (۹/ التوبة: ۶)

”اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔“

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کہ اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلامِ الہی سنایا جائے، تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا اس کے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلا وطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيُكُونَ الدِّينُ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ﴾ (۸/ الانفال: ۳۹)

”اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔“

”فتنہ“ سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے۔ ایک شخص نے آ کر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور اوپر کی آیت پیش کی انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا یا اس کو لوگ مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ ❁

❁ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الانفال، باب قوله تعالیٰ ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً﴾

## میدان جنگ میں تبلیغ

نادانفوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سر تا پا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی فوج کو متعین کرتے تو اس کے سرور کو یہ ہدایت فرماتے:

”جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر زمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔“ ❁

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بزور شمشیر مسلمان بنا لینا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ ”میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں“ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے۔“ ❁ اس سے

❁ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعث : ۴۵۲۔

❁ جامع ترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی الدعوة قبل القتال: ۱۵۴۸۔

معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔  
 ثمامہ بن اثالؓ قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخربیک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلہ پیدا ہوا تھا۔ ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھجے میں باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا: ”ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟“ جواب دیا: محمد میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کر دو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زرفندیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال دیا جواب ہوا پھر تیسرے دن۔ تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”ثمامہ کو چھوڑ دو۔“ لوگوں نے کھول دیا وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے ❁ کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن انہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا: ﴿قَاتِلُوا مَا بَعْدَهُ وَانْقَادُوا لَهُ﴾ (۴۷ / محمد: ۴) ”لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔“ یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوہ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ وہ پوچھتے ہیں: یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا: ”آہستگی سے روانہ ہو، یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا وہ ان کو بتاؤ خدا کی قسم! اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔“ ❁ چنانچہ خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آدر اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک پھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور

❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفہ و حدیث ثمامہ بن اثال: ۴۳۷۲؛ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الأسیر یوثق: ۲۶۷۹۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر: ۴۲۱۰۔

جب میرے حملہ کی باری آئی تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے ”میں مسلمان ہوتا ہوں“ تو اے خدا کے رسول! میں کیا کروں اس کو قتل کروں؟ فرمایا: ”نہیں اس کا قتل جائز نہیں۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا: ”پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ، وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرار تو حید سے پہلے تھا۔“ ❁

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے، جب گھسان کارن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الا اللہ پکارا تھا، ایک انصاری جو پہلے اس پر چھپے تھے وہ تورک گئے مگر اسامہ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو اسامہ سے سخت آزرده ہوئے، اسامہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا: ”اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟“ پھر برابر یہ فرماتے رہے: ”اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا الہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے؟“ اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت ہوئی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش! میں آج ہی مسلمان ہوتا۔ ❁

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آور لڑائی کے گھسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے وہ جب مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اصرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله)) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ تو حید کا اقرار نہ کریں جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پریش خدا کا کام ہے۔“ ❁ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ تو حید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں خدا کا ہے۔ یہ بالکل ایک مصالحتانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ اسلام کا حکم تھا کہ

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحريم قتل الكافر بعد قوله لا اله الا الله: ۲۷۴۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ايضا: ۲۷۸، ۲۷۹۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتى يقولوا لا اله الا الله: ۱۲۴۔



مسلمان دیوانہ وار تلوار لیے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ گلہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار تو حید کے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿وَاِنْ جَاءَكُمْ مِنَ الْمُسْلِمِ فَاَجْتَمِعْ لَهَا﴾ (۸/ الانفال: ۶۱)

”اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھکے تو، تو بھی جھک جا۔“

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجْرُهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلِمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلَغْهُ مَامَنْتَ بِهَا﴾

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹﴾ (۹/ التوبة: ۶)

”اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔“

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہوتا تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے:

﴿فَاِنْ اَعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يَفْعَلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلْمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا﴾

(۴/ النساء: ۹۰)

”تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔“

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگ جوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا تلوار یا اسلام تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

صلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ صلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم

کیے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار تھا، راستوں پر ہزنون اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اس لیے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی، تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوہ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لیے ادھر ادھر بھیجا تب وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجع میں ستر (۷۰) داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سر یہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ، ذات اطلاق میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

### تبلیغ و دعوت کی تنظیم

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آجاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے۔ مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آجاتے تھے، آپ ساہلہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔ الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے، اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشن ہو گئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پر جوش نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے جن کے موثر و عظوم کو سن کر

آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نو مسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطراف ملک سے دارالسلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ (چہوترا والے) مشہور ہے، اس میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے اور خود نو مسلموں کو تعلیم دیتے۔ بیرونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ وہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس (۳۵) صحابیوں کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں: ابو ذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی، جعفر طیار، عمرو بن عبسہ سلمی، ضناد بن ثعلبہ، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن لبید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علاء بن حضرمی، ابو موسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبد اللہ بکلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمیری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، و بر بن نخیس، عمرو بن مسعود ثقفی، عامر بن شہر، مقصد بن حبان، ثمامہ بن اثال، حبیصہ بن مسعود، احنف، ابو زید انصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ریح مخزومی، واثلہ بن اسقع، عبد اللہ بن حذافہ کعبی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہم۔ انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکارت تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لیے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سنا تے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا

تھا، اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں، بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک ڈھال اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿فَلَا تُطِيعُ الْكُفْرِينَ وَجَاهِذْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۵۲)

”تو اے پیغمبر! منکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور و شور سے جہاد کر۔“

اس پیغامِ الہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدٌ﴾ (۴۰/ ق: ۵۰)

”تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔“

قرآن رحمت عالم کا پیامِ عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے۔ فرمایا:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۱)

”برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندہ پر اس لیے اتاری تاکہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔“

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

### اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔ اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوت دی جاتی پھر یہود کو حلقہٴ بغوشِ اسلام بنایا جاتا اور اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام کمی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لیے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذابِ الہی سے تحویف اور ضابطہٴ قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن کا طرزِ خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصصِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔ سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیاشیوں کا وفد آیا اسی زمانہ میں سورہٴ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجموع عرب میں بہت کم تھے بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو شویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے تو حید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل کا جو یا تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طاہر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز تمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور ملامت تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جزا فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین فتح کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ انصار مدینہ نے خود آ کر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زد و کوب کیا، اس نے آ کر آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر اہل عمان

ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔“ ❁

یمامہ کے رئیس ثمامہ بن العنقہ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جو اثنی عشریوں نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا، اسی قریہ جو اثنی عشریوں کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعیہ کاؤں میں پڑھا گیا ❁ بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگر چہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔ ❁

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اور یمن میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرہ تھا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ❁

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو طہا کر کیا ہے:

﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَنْ لَا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (۹/ التوبة: ۹۷)

”دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔“

❁ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل اہل عمان: ۶۴۹۵۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القرى والمدن: ۸۹۲۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ: ۱۱۵، ۱۱۶۔

❁ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن ابی طالب: ۶۴۱۰۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام ”بیعت اعرابی“ تھا جو کم درجہ کبھی جاتی تھی اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلک رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ ❁

اشاعت اسلام کے اسباب و ذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلا یا اور آپ کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک صحابی کے قبول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے:

① اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزہ قرآنی تھا، قرآن مجید جس موثر اور دل کیپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عواقب اور موافق جن کا اوپر ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بقولمونی، مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرز استدلال کرتا تھا:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ مُمِدَّتْكُمْ فَمِنْ بَيْنِكُمْ مَوْتٌ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

(۲/ البقرة: ۲۸)

”تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا اور پھر زندہ کرے گا اور پھر اس کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔“

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفَلَکِ الَّذِي يُجْرِي فِي النَّعْرِيبَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَكَصْرِيفِ الزَّيْتِ وَالسَّحَابِ الْمَسْحُورِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴾

(۲/ البقرة: ۱۶۴)

”آسمان وزمین کی پیدائش میں، شب وروز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سود مند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسائے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی سے مسخر ہیں دانشمندوں کے لیے یقینا بڑی نشانیاں ہیں۔“

❁ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب تحریم رجوع المهاجر الی استیطان وطنه: ۴۸۲۵ سنن نسائی،

کتاب البیعة، باب المرتد اعرابیا بعد الهجرة: ۴۱۹۱۔

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَابْتِغَاءَ مَبْرَأٍ لَأَسْلَمُوا مِنْ رَبِّكَ يَا أَيُّهَا الرَّحْمَنُ﴾

(۳/ آل عمران: ۸۳)

”آسمان وزمین میں جو بھی ہے، برضایا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے، اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔“

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقَعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ رَبُّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

”آسمان وزمین کی خلقت، اور شب وروز کے الٹ پھیر میں، ان ارباب عقل کے لیے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھے، لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں، کہ خدا یا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔“

﴿هُوَ الَّذِي يَسِّرُ لَكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ ۗ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَبَئًا ۗ وَكَرِهُوا بِهَا جَاءَ نَهَايْرُهُمْ عَاصِفٌ ۗ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ۗ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۗ دَعَا اللَّهُ الْمُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۲)

”وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا آشتی والوں کو خوب لیے جارہی ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعۃً) زور کا بھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آگئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خالص خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔“

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۗ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ أَلْسِنَتِكُمْ وَالْأَوَانِكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ۗ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاءُكُمْ مِنْ قُضِيِّكُمْ مِنْ قَضَائِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ۗ﴾ (۳۰/ الروم: ۲۱-۲۳)

”اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے تم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے



لیے نشانیاں ہیں۔“

خدا، یا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے:

﴿ اِنِّی اللّٰهُ شَکُّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۱۰)

”کیا خدا میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔“

﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاکُمْ ثُمَّ مُیْتًا ثُمَّ یَحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(البقرہ: ۲۸)

”اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم

کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

عرب میں لحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگر چہ مانتے تھے، لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم انہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لیے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا انہیں معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، انہیں سے محبت رکھتے تھے، انہیں پر نذر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معروکوں میں انہیں کے نام کی جے پکارتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصلی وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ جَلْهًا اَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَادِیْ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرِیْنَ حَاجِزًا ۝ ؕ ؕ ؕ اَللّٰهُ مَعَ اللّٰهِ ۝ بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ مُّجِیْبَ الْمُنْطَضِرِ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ

السُّوءَ وَیَجْعَلْکُمْ خَلَآءَ الْاَرْضِ ۝ ؕ ؕ ؕ اَللّٰهُ مَعَ اللّٰهِ ط قَلِیْلًا مَّا تَذْکُرُوْنَ ۝ اَمَّنْ یَّهْدِیْکُمْ فِی

ظُلُمٰتِ الدَّیْرِ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیْحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ ۝ ؕ ؕ ؕ اَللّٰهُ مَعَ اللّٰهِ ط تَعْلٰی اللّٰهُ

عَمَّا یُشْرَکُوْنَ ۝ اَمَّنْ یَّتَدْوٰ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗا وَمَنْ یَّرْزُقْکُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ ؕ ؕ ؕ اَللّٰهُ

مَعَ اللّٰهِ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ﴾ (۲۷ / النمل: ۶۱-۶۴)

”کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لیے

پھاڑوں کی مینیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اونٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطر لوگ کی منتا ہے، جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفریش کا آغاز کرتا ہے؟ پھر اس کو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگرچے ہو تو دلیل لاؤ۔“

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ﴿مَنْ يُنْفِئِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾ (۷۸: یس) یعنی ”ہڈیاں گل سرچکیں تو اب کون ان کو جلوائے گا۔“ قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْكُمْ لَئِنْ مُنِنَّا عَلَيْهِمْ لَنَنْزِلَنَّ سَحَابًا مِمَّا تَخْتِطُونَ فِيهَا الْعِظَامَ فَتَسْوِئُهَا فَإِنَّهَا أَكْبَادٌ فَتَصْفُونَهَا فَاغْوَا عَنِهَا إِنَّكُمْ كَجَائِلُونَ﴾ (۷۵: القیامۃ: ۳۷-۴۰)

”کیا انسان پہلے مٹی نہیں تھا، پھر گوشت کا ٹوٹھا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟“

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جو داور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعرا اور خطبا قرآن ہی سن کر ایمان لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ ہم تمہارے لیے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے ختم کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾

(۴۱/ ختم السجدۃ: ۱۳)

”تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عادی و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔“

تو عقبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لیے بس، تم کو قربت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شعر ہے نہ جادو، نہ کہانت ہے ﴿بلکہ کوئی اور چیز ہے﴾ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرا کے عرب میں تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیق حال کے لیے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شعرا دونوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ ﴿

ولید بن مغیرہ (حضرت خالد بن ولید کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرٍ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِنِّي أَدِينُ إِلَى اللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَالْبَنِيِّ يَعْظُمُ عَلَيْكُمْ تَذَكُّرُونَ﴾ ﴿١٦/ النحل: ٩٠﴾

”خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔“

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ ﴿عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھالیا، پھر فرمایا: ”ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے۔“ یہ کہہ کر آپ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ ﴿

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورہ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خُلِقُوا مِنْ لَدُنِ رَبِّكَ مُصَيَّبُونَ ﴿٣٦﴾﴾ ﴿٥٢/ الطور: ٣٥-٣٧﴾

”کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ کیا یہی لوگ

﴿علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٤ میں مسند ابویعلیٰ وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ سیرۃ سوم، میں مصنف نے اس کے لیے کتاب الطیر ابن مردودہ، مسند ابی یعلیٰ وسیرۃ اسحاق کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام، ج ١، ص: ١٨٠۔ ﴿صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل امی ذر: ٦٣٥٩۔ ﴿الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٦ بحوالہ عبدالرزاق۔

﴿مسند احمد، ج ١، ص ٣١٨ وادب المفرد امام بخاری باب البغی ٨٩٣۔

سربراہ کار ہیں۔“

تو خود جبریلؑ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ \*  
 طفیل بن عمروؓ مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے لوگوں کو  
 ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ  
 لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب حرم میں اتفاقاً آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے  
 اور مسلمان ہو گئے۔ \*

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ  
 ادھر سے جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو ﴿وَالسَّمَاءُ  
 وَالطَّارِقُ﴾ (۸۶ / الطارق: ۱) ”قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔“ پڑھتے سنا تو اس  
 قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی \* اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابو بکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس زمانہ میں  
 حضرت موصوف نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز باواز بلند پڑھتے تھے آواز  
 سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھینچتا، چنانچہ  
 اسی بنا پر کفار نے حضرت ابو بکرؓ سے شکایت کی قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں  
 مفتون ہوتی جاتی ہیں \* انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو  
 لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آئہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی  
 کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو  
 حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم! یہ کلام  
 اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ \*

جہش میں جب آپ ﷺ کی بعثت کا چرچا ہوا تو میں شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لیے  
 مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان  
 کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ  
 لوگ اٹھے تو ابو جہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا

\* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الطور: ۴۸۵۴۔ \* ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاوالمعاد)  
 نے یہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق، ج ۲، ص ۳۳۰ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ۴، ص: ۲۳۷، الاصابہ،  
 ج ۲، ص: ۴۲۲؛ تاریخ دمشق، ج ۲۷، ص: ۹۔ \* مسند احمد، ج ۴، ص: ۳۳۵۔

\* بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرة النبى ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۰۔

\* مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۹۱۔ مسند کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ان هذا والذي جاء به موسى ليخرج من مشكاة  
 واحدة، لیکن یرت ابن ہشام میں وہ الفاظ ہیں: من کا ترجمہ مصنف نے کیا ہے۔ ”من“

دھب بدل لیا۔ انہوں نے کہا: ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لَكُمْ دِينُنْكُمْ وَ لَنَا دِينُنَا۔ \*  
 قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں  
 رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صد با کافر مسلمان تھے۔ \*  
 ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت  
 کی بنا پر، یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا  
 اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ اور کسی شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے  
 تھے۔ بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں  
 ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف  
 تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و  
 بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا۔ دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور  
 مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزاء، بعث و نشر، جور و ظلم کی  
 تفتیح، اخلاقِ حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو  
 یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان  
 کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موافق کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے  
 اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں۔  
 مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی ﷺ نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی  
 اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعہ فنا  
 نہ ہو جاتے یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص  
 مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ایک معزز اور رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا  
 مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے

\* ابن ہشام حدیث نقض الصحیفة، ج ۱، ص: ۲۳۷۔

\* جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورة الروم: ۳۱۹۴۔

بار بار دارالنبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چارونا چار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

① قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان، ریاست و خود سری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسرہ ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ روہاسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لیے اگر کوئی خود غرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، موافقہ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریحی نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدراہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

② نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق اور اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت اور اپنے ربانی کوششوں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے۔ ﴿مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ (یوسف: ۲۱) قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس و معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَقَدْ كَذَّبْتَ وَيَسْئَلُونَكَ عَمَّا هُنَّ قَبْلَهُ ۗ فَأَنْتَ تَعْقِلُون﴾ (یونس: ۱۶)

”اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔“

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی ”امین“ کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، یہی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں، نبوت محمدی کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا، ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کارا کیا تھا، ۴۰ برس کے معجزانہ

اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں ”محمد ﷺ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں بتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔“ ❁

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے بھائی کو تحقیق حال کے لیے بھیجا، انہوں نے واپس آ کر پیکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ❁

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی ﷺ کے ساتھ گوعداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے۔ اسلام کے سب سے اول اعلان دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا: ”اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا چجانو گے؟“ سب نے بیک آواز کہا: محمد ﷺ! تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی ❁ ابو سفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۱ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے، انہوں نے شہادت دی کہ ”محمد ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بد عہدی نہ کی، شکر سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں۔“ ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ ”نبوت کے نبی آثار و دلائل ہیں“ یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابو سفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ ❁

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، غنودہ درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظًا لَاقْتَضَى الْقَلْبُ لَأَنْقَضُوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵۹)

”اور محمد (ﷺ) اگر تم درشت خوار سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔“

- ❁ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحي: ۳۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، اسلام  
ابن ذر: ۳۸۶۱۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة تبت: ۴۹۷۱، صحیح مسلم، کتاب  
الایمان، باب: اوانذر عشیرتک الاقربین: ۵۰۸۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحي: ۷۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اواہام کو دم میں منادیت تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اسے قبیلہ میں آ کر اس نے کہا: ”لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔“ ❁

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سواونٹ دے دیے۔ خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دے دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبعوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔ ❁ ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ احد میں قوت بازوئے اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا، اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، فتح مکہ میں بھییں بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی، تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی، یا رسول اللہ ﷺ اس سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر اتنا مجھے مبعوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر اتنا محبوب نہیں، آپ نے یہ سن کر فرمایا: ”خدا کی قسم! ہمارا بھی یہی حال تھا۔“ ❁

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔“ اس نے کہا کہ میں تولے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے کہا: ”تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔“ چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھ رہے صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔“ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ”میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ تو راۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔“ ❁

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ”ثمامہ تمہارے

❁ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخاۃ ﷺ: ۶۰۲۰، ۶۰۲۱۔

❁ صحیح مسلم، باب مذکور: ۶۰۲۲۔ ❁ مسلم، کتاب الاقضية، باب قضیۃ ہند۔ ۴۸۰۔

❁ رواہ البیہقی فی دلائل النبوة، ج ۶، ص: ۲۸۰؛ مشکوٰۃ کتاب الفضائل، باب فی اخلاقہ ﷺ: ۵۸۳۲۔



ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔“ اس نے کہا کہ اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونخوئی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عنفو فرمائیں گے تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گره کھول دیے اور ہار کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا: ”محمد ﷺ! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے۔“

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا۔ صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لیے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے آپ ﷺ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے باری باری سے پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے کھجور، آنا اور ستھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا اس نے کہا، راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بدین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم! وہ یا تو اس آسمان وزمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔

نبوت کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا، اعجاز اور سر تا پا اعجاز ہوتی ہے۔

رونے و آواز پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل ہو گیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن

صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب ربط الاسبور وحبسہ: ۴۵۸۹۔

بخاری، کتاب التیمم، باب الصعد الطیب وضوء المسلم یکفیه عن الماء: ۳۴۴۔

سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نکلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ((افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا الناس نیام تدخلوا الجنة بسلام)) \* واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر ابوایوب انصاری کے مکان میں جو نبی پینچے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کو مانن دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ \*

ضداد ایک شخص تھے جن سے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ نامہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس گئے اور کہا ”محمد ﷺ! ایس جنون کا علاج کرتا ہوں“ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

((الحمد لله نحمده و نستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له و اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان محمدا عبده ورسوله))

”تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا، جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ تمہارا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔“

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ ﷺ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کانوں جا دو گروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے، لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ \*

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حارث رضی اللہ عنہ یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے کہ تمہارا بیٹا ہوتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا کہ بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا: ”ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا تھا۔“ ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دیر پا ہوا کہ وہ کہا کرتے

\* مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۵۱۔

\* بخاری، کتاب مناقب الانصار۔ باب ہجرة النبي ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۱۱۔

\* مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف الصلوة والخطبة: ۲۰۰۸۔

تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ ❁  
 انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل  
 نہایت پر جلال تھی، چہرہ پر نور تھا، آواز موثر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے  
 ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیتا تھا اسی اثر سے متاثر ہو کر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نو مسلم یہودی عالم  
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھے تھے:

وجہہ لیس بوجہ کذاب۔ ❁

”جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔“

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوتا تھا:

هذا وجه مبارك ❁ ”یہ مبارک چہرہ ہے۔“

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا ابورافع نام ایک شخص  
 قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے جوں ہی چہرہ اقدس پر نظر پڑی وہ  
 بہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا ❁ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو فخر سمجھا۔ ❁

❁ اصابہ، ج ۱، ص: ۲۹۶ تذکرہ حارث ابن عبد العزی۔

❁ جامع ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حدیث: افسوا السلام: ۲۴۸۵۔

❁ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب المواقیب: ۱۷۴۲۔

❁ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی الامام يستجن به فی العہود: ۲۷۵۸۔

❁ اصابہ: ۶۵، ۶۶ واستیعاب، ج ۲، ص: ۶۶۸۔

## اسلام

یا  
محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتمم بالشان کام کو انجام دینے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پر تو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عواقب، موانع، شہبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں و تاباں ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی، اخلاص، ایثار، دین، تقویٰ، ایمان داری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا وہ گو یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

((الا ان الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات والارض)) ❁

”ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے

آسمان و زمین کو پیدا کیا۔“

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پردرد

الوداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے: ❁

((قد تركتكم على مثل البيضاء ليلها ونهارها سواء))

”میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑے جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی

دن کے مانند ہے۔“

اور آ خر حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (۵ / المائدة: ۳)

”آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔“

پروفیسر مارگولیتھ، جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

❁ بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع: ۴۴۰۶۔ سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب اتباع

السنۃ: ۵؛ مستدرک حاکم، ج ۱، ص ۹۶؛ مسند احمد، ج ۴، ص ۱۲۶۔

”محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔“ \*

ایک (دور) یورپ کے بیگانہ مستشرق کی نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے، اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور جاعص) نے لکھا:

”دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس \* کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہیں۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا، تاکہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا، نامہ مسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی

\* لائف آف محمد مارگویتھ صفحہ ۳۷۱۔ \* مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

انگلستان کا مشہور دانش پر دا ز کار لائل نے اپنے ”ہیر و زاینڈ ہیر و ورشپ“ میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار ”محمد“ آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے:

”قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔“

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگی ہو اور یہ اس لیے کہ تمام انبیاء ﷺ میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔“

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضاے حاجت کیونکر کرنی چاہیے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں یہ سچ ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، ان میں کوئی بڑی اور گوبر نہ ہو۔ نبوت محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متدن سے متدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے، عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ کی بعثت تھی، اس لیے آپ کی

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون قرآن، ج ۱۵، صفحہ ۵۹۸۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ۳۵۳۵ و جامع ترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل النبی والانبیاء ۲۸۶۲۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب الاستنجاء بالحجارة ۱۶، سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ، باب الاستنجاء بالحجارة والنہی عن الروث ۳۱۶۔

تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تھا جاتا ہے اور ان کو تمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور لٹروں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کا کاروبار، انسانوں کے ساتھ، معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔ آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حادی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قومی اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین قسمیں ہیں: خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت، الفت، نیکی اور بھلائی کا برتاؤ اور گواہی لیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے، وہ انہیں چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، انہیں کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

## عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم ”دل“ کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا:

((الوان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا افسدت

فسد الجسد کلہ الا وہی القلب)) ❁

”انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، خبردار کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔“

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ”قَلْبٌ سَلِيمٌ“ ❁ (سلامت رودل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت رومی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ”قَلْبٌ اَنِيمٌ“ ❁ ﴿قَالَ اِنَّهُمْ قَلْبُهُ ط﴾ (البقرہ: ۲۸۳) (گناہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ”قَلْبٌ مُّبِينٌ“ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور سب راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً اپنی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((انما الاعمال بالنیات)) ❁

”تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔“

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

((انما لكل امریء ما نوای فمن كانت ہجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأۃ

ینکحها فہجرته الی ما ہاجر الیہ)) ❁

❁ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ: ۵۲۔

❁ قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے: ﴿قَالَ اِنَّهُمْ قَلْبُهُ ط﴾ (بقرہ: ۲۸۳)

❁ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ: ۱۔ ❁ ایضاً۔



”ہر شخص کے کام کا شرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔“

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بدابہت ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ اب صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو راہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے پاپہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔ عبد اللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیے تھے مگر بائیں ہمد مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! عبد اللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیے ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا: ”نہیں اے عائشہ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ ”باراہبا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔“

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ ”اے محمد ﷺ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی مال غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے“ فرمایا: ”کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟“ اس نے جواب دیا، نہیں۔ فرمایا: ”واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔“ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان

کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ”کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟“ اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا: ”میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا۔“ غالباً مسلمانوں کی تعداد کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا: ”تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟“ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔ ❁

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راہک سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۗ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۱۸)

”جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راہک کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔“

سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ سَائِغًا ۗ﴾ (۲۴/ النور: ۳۹)

”جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔“

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سو جھانکی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لَّيْلِيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۗ ظَلَمْتُ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكِدْ يَرِيهَا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ۝﴾

(۲۴/ النور: ۴۰)

❁ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسير، باب کراہة الاستعانة فی الغزو و بکافر: ۴۷۰۰۔

”یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہے اور اس کے اوپر بادل گہرا ہو یہ تو اندھیرا ہے کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سو جھانپی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں۔“

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لیے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور بیچ سمجھتی ہے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْلُغُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِيَاءًا لِلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَا لَهُ كَمْ يَسْعَىٰ فِي صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَمَرَّكَهُ صِلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَكْسِبُونَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝﴾

(۲/ البقرة: ۲۶۶)

”اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ بر باد کرو جس طرح وہ بر باد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برسنا تو مٹی دھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں۔“

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے، وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تار یک نظر آئے، اور ہمارے کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراہ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے \* اس کے برخلاف فلسفہ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی،

مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ مرتا پانیاخیائی فلسفہ بن گئے، جس سے تصویریت ان کی عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پاسکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ، اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا و سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تبار خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پاسکے اور اسی کی رضا جوئی اور اس کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تبار غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر ایسا دل سے یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات ہمارے غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔ خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم انہیں کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور استبازاری کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکامِ الہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی اور نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری راہنمائی کے لیے نہیں ہوگی۔

خدا کے دستوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانونِ الہی کے مطابق چلاتے ہیں اور

ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ محفوظ کرتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بُرا معاوضہ مل سکے۔ خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہو اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے، جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سر اپا زندگی اور بے ہیبت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے اس لیے روز جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ خمسہ ایک جا طور پر سورہ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۗ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ  
بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۗ﴾ (٢/ البقرة: ٤، ٣)

”جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد ﷺ اترا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر)۔“

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۗ﴾ (٢/ البقرة: ٤)

”اور آخرت (روز) جزا پر یقین رکھتے ہیں۔“

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

﴿وَلَكِنَّ الْإِنْسَانَ مِنَ أَمَنِ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ۗ﴾

(٢/ البقرة: ١٧٧)

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر

ایمان لائے۔“

سورہ کے آخر میں ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۗ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ  
وَرَسُوْلِهِ ۗ ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۸۵)

”پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اور تمام مومن اس پر ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔“

سورہ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَالْكِتٰبِ الَّذِي نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهِ وَالْكِتٰبِ الَّذِي  
اُنزِلَ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرَسُوْلِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ  
بَعِيْدًا ۙ ﴾ (۴/ النساء: ۱۳۶)

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔“

## اللہ تعالیٰ پر ایمان

﴿ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۸۵)

ایک قادر مطلق اور بہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ایجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور معارف و حقائق اور جسمانی اعمال و اخلاق کا سر بنیاد قرار دیا۔ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے، مگر اس ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ﴾ (۴/ النساء: ۱۱۶)

”یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔“

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسما و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت محمدیہ ﷺ کی غرض و غایت صرف تخیل پر نظریہ آرائی اور الہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی اور تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونہ عمل بنانا تھا اس لیے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے رموز اور اسرار توحید کا اس طرح حاصل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی تباہ کنی کی جائے۔

### اصلاح عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔ شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا

ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور و رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔ شرک کی جو گونا گوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

### تعدد خدا کا ابطال

① دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً: صفت خلق اور احیاء و اماتت، برہما، مٹن، ہمیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمن و شمال، نرم و سخت، رات و دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فقر و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضادات سے خالی نہیں، اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزداں اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک، روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوتا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورہ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعال خیر و شرک کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شرک کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شرک کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناعت مصور اگر ایک نہایت بد صورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ



اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برالیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے، نہ کوئی شر محض، اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

﴿ أَشْرَأُيَدٌ يَمِينٌ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَآكَ يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَشْرَارُ عَنْ عُنُقِهِمْ يَوْمَ يَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَعْقَابِهِمْ فَأَتِيَهُمْ جُنُودٌ أَلْوَنٌ ﴿٧٢﴾ (البجن: ١٠٠)

”آیا اہل زمین کے ساتھ شرکار اداہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔“

﴿ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنَ نَفْسِكَ ﴾

(٤ / النساء: ٧٩)

”تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔“

﴿ أَوَلَمْ تَرَ أَنَّا أَوْصَاكُم مِّنْ قَبْلُ بِأَلَّا تَدْعُوا إِلَىٰ هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ﴾

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣﴾ (آل عمران: ١٦٥)

”کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی، جس کے برابر تم ان کو پہنچانچکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی

کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔“

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلوں ہیں، شر نہیں ہے ان میں سے اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لیے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بُری چیزوں کے لیے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دونوں:

﴿ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُْوا الْهَيْهَاتَيْنِ أَلْمِينًا ۚ إِنَّهُمَا هُوَ إِلَهُ وَوَاحِدٌ ۚ فَأَتَابُوا فَأَرْهَبُون ۚ وَكَذَلِكَ مَا فِي

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴿١٦﴾ (النحل: ٥٢، ٥١)

”اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ، وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کے لیے ہے جو

آسمانوں اور زمین میں ہے۔“

② بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰ غلیظاً، رام چندر، کرشن، کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر

قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر عرب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۗ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ﴾ (٤/ النساء: ١٧١)

”اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔“

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۗ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا﴾ (٤/ النساء: ١٧٢)

”مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔“

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۗ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ ۗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۗ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (٥/ المائدة: ١٧)

”وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح ابن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے خدا ہی کے لیے آسمان وزمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔“

﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ۗ أَنْتَ قُلْتُ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمَّيَ الْهَيْبِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِدِينٍ ۗ إِن كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۗ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۗ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ عَبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾ (٥/ المائدة: ١١٦، ١١٧)

”اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ (علیہ السلام)! تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا تو، تو جانتا ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔“

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصل کون و مکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَا إِلَهُكُمْ إِلَهًا وَاحِدًا ﴾ (١٨ / الكهف: ١١٠)

”کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں، لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔“

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں، ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب خلیل اللہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے آپ نے کیا لقب پسند کیا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، ورد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا

(أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ)

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔“

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق

میں دعائے بدکی اس پر یہ آیت اتری: ﴿

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴾

(٣ / آل عمران: ١٢٨)

”تم کو کچھ اختیار نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ﴾ (٢٨ / القصص: ٥٦) ﴿

”تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا: ﴿

﴿ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ ﴾

(٩ / التوبة: ٨٠)

”تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لیے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از

صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة احد، باب ليس لك من الامر شيء: ٤٠٦٩، ٤٠٧٠ یہ حدیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ ﴿ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سررة القصص: ٤٧٧٢۔

صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورة التوبة: ٤٦٧٠، ٤٦٧١۔

اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے:

((لا تطرونی کما اطرت النصارى ابن مریم)) ❁

”میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔“

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر عجب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا: ”ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔“ ❁

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ”سید خدا ہے۔“ لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے۔“ ❁ اصلی الفاظ یہ ہیں: ((قولوا بقولکم ولا یستحیونکم الشیطان))

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرانہ دے میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔“ ❁

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر تو حید کو شرک کے ہر شاخہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

### ③ درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا معجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجارہ کار ہے اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، انہیں کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے انہیں کا نام لیتے ہیں، انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں

❁ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم: ۲۴۴۵۔

❁ مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۴۸ علی شرط الشیخین؛ ابن ماجہ، ابواب الاطعمہ، باب القیدی: ۳۳۱۲۔

❁ ادب المفرد امام بخاری، باب هل یقول سیدی: ۲۱۱ وابدوداد، کتاب الإدب، باب فی کراہۃ التمداد،

ح: ۴۸۰۶۔ ❁ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۵۳۔

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ مجبورین کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی، اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

﴿لَا سْتَغْفِرُونَ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ط﴾ (٦٠ / الممتحنة: ٤)

”میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کر لوں۔“ ✽

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿وَإِنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (٢٦ / الشعراء: ٢١٤) تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ”اے قریشیو! اے اولاد و عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ ✽

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کا رخا نہ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

﴿قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا﴾ (١٧ / بنی اسرائیل: ٥٦، ٥٧)

”کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔“

④ خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جس اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار

✽ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ رہ فی زیارة قبر امہ: ٢٢٥٨، ٢٢٥٩۔

✽ یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدایا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خاص نبوت میں ہے کہ یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا۔ قرآن مجید میں خرق عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیے گئے:

① معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے:

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ (٦ / الانعام: ٣٧)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترتا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن لوگ نہیں جانتے۔“

② باوجود اس کے کفار کو معجزہ ظہری سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں:

﴿ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (١٣ / رعد: ٧)

”اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترتا، بے شک آپ ﷺ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والے ہیں۔“

﴿ وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَنْزِلَ لَنَا مِنَ السَّمَاءِ آيَةٌ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَجِيلٍ وَوَعْدُكَ فَتُحْيِي الْأَمْمَاتَ خَلَلَهَا تَجْمِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتُمْ عَلَيْنَا كِفَاؤًا أَوْ تَأْتِيَنَا بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قِيْلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرَفٍ أَوْ تَرْفَى فِي السَّمَاءِ وَلَكِنْ نُؤْمِنُ بِرُوحِكَ حَتَّى تَنْزِلَ عَلَيْنَا كِتَابًا تُفَرِّقُ بِهِ قُلُوبَ سُلَيْمَانَ وَرَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴾

(١٧ / بنی اسرائیل: ٩٠-٩٣)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجور دن یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیج میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ! میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔“

③ جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا آتَيْنَاهُ آيَاتٍ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَوْ لَعَنَهُمْ أَنَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرًا لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾ (۲۹/ العنکبوت: ۵۱، ۵۰)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کفار کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شبہ ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔“

اسی لیے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

⑤ حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

شرک کی ایک قسم یہی تھی کہ انبیاء ﷺ یا پیشوایان مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

﴿إِخْتِذُوا وَأَحْبَبُوا هُمْ وَوَدُّوا لَهُمْ آرْبَابًا﴾ (۹/ التوبة: ۳۱)

”ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔“

تو حضرت عدی بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں؟“ عرض کی کہ ”ہاں“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہی رب بنانا ہے۔“ عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تائیس، حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبوی ﷺ کی صفیہ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَاكَ إِلَّا رَسُولًا ۖ قَدْ خَلَّكَ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۴)

جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة التوبة: ۳۰۹۵ وابن کثیر تفسیر آیت مذکور، ج ۲، ص ۳۴۸۔

”محمد (ﷺ) تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔“

﴿إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ﴾ (٤/ النساء: ١٧١)

”مریم کا بیٹا عیسیٰ، اللہ کا صرف رسول تھا۔“

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت و نبوت کے اوصاف ہیں۔

### ⑤ غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی مرتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے۔ سجدہ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقدداں یا دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور مسلمانین و امرا کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدہ تعظیمی یا سجدہ محبت جائز تھا چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے، وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟“ عرض کی کہ نہیں، فرمایا: ”تو اب بھی نہ کرو اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ ❁ اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”یہ تم نے کیا کیا؟“ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا: ”ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ ❁

### ⑦ صفات الہی کی توحید

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ شرکت و صف کی بنا پر، خدا کے شریک اور ہمسرن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیا کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ عرب میں بھی کاہن

❁ ابو داؤد، کتاب النکاح، حق الزوج علی المرأة: ٢١٤۔

❁ ابن ماجہ، ابواب النکاح، حق الزوج علی المرأة: ١٨٥٣۔



یہی پیش کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے۔ کبھی فال سے، کبھی پانے پھینک کر، کبھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان کو جناتِ غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں۔ خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

﴿وَعِنْدَكَ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ (۶/ الانعام: ۵۹)

”اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا: ”مفتاحِ غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

① حمل یعنی لڑکا ہو گا یا لڑکی۔

② کل کیا ہوگا۔

③ بارش کب ہوگی۔

④ کس جگہ موت آئے گی۔

⑤ قیامت کب آئے گی۔“

اگرچہ علمِ غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علمِ غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علمِ غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے انصار کی چند لڑکیاں گارہی تھیں گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا:

((وَفِينَا رَسُولٌ يَعْلَمُ مَا فِي غَدِّ))

”اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کس کی بات جانتا ہے۔“

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا: ”یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گارہی تھیں۔“ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبِ﴾ (۶/ الانعام: ۵۰)

”کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی

باتیں جانتا ہوں۔“

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ﴾ (۲۷/ النمل: ۶۵)

صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ: عالم الغیب فلا ینظر علی غیبہ احد! ۷۳۷۹، میں یہ تفصیل مذکور ہے۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ: ۵۱۴۷، ابوداؤد، کتاب الادب: ۹۲۲؛ ترمذی، ابواب النکاح: ۱۰۹۰۔

”کہہ دو اسے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔“

غیب دانی کے مدعی کا ہن جو عرب کی گلگی گلگی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابہ نے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے فرمایا: ”اب نہ جایا کرو۔“ عرض کی: ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے فرمایا: ”یہ تمہارا وہم تھا اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو۔“ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا: ”کاہن کچھ نہیں۔“ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا: ”شیطان ایک آدھ بت سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔“ کبھی فرمایا کہ ”مفرتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔“ جابلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عراف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لیے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔“ علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے اس کا سیکھنا بھی جاوید کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا: ”جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔“ ❁

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگون بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خُدا عا نہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و دوسوہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

### ⑤ مخفی قوتوں کا ابطال

کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی و پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دیا اور دعا و کلمات الہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹونکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پایا اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر

❁ مشکوٰۃ باب الکھانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث، ابو داؤد، کتاب الکھانۃ، باب فی الکھانۃ، ۳۹۰۴، ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب النہی عن اتیان الحائض، ۶۳۹، مسند احمد، ج ۲، ص ۴۲۹، ۴۷۶ سے لی ہیں۔

رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ (۱/ الفاتحة: ۵)

”(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔“

سحر و طلسم و جادو اور ٹونکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا:

﴿وَمَا هُمْ بِضَآئِرِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَلَقَدْ عَلَّمُوا لَعْنًا اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ ۗ﴾ (۲/ البقرة: ۱۰۲)

”یہ جادو اور ٹونکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹونکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔“

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

﴿يَحْتَلِلُ إِلَيْهِمْ مِنْ سِحْرِهِمْ أَهْهَا تَسْمَعُ ۗ﴾ (۲۰/ طه: ۶۶)

”مصری جادو گروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔“

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادو گروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا ❁ تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل وہ بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ”تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔“ ❁ ایک اور صحابی نے ایک بیماریا پاگل کو سورہ فاتحہ پڑھ کر چند روز پھونکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا تو فرمایا ”میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچے جھاڑ کی روزی کھائی۔“ ❁ ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الرقى والتائمات والتولة شرك)) ❁

”بے شک جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔“

❁ جامع ترمذی، ابواب الحدود، ماجاء فی حد الساحر: ۱۶۶۰ و ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اخذ

الجزية من المجوس: ۳۰۴۳۔ ❁ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقى: ۳۸۸۶۔

❁ ابوداؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقى: ۳۸۹۶۔

❁ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التائمات: ۳۸۸۳؛ ابن ماجہ، ابواب الطب: ۲۵۳۰۔

انہیں صحابی کے گھر میں ایک بڑھسیا آیا کرتی تھی گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ عبد اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ 'جھاز، پھونک گندے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔' ان کی بیوی نے کہا: کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا، جب اس جھاڑتی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھرتا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں: "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے۔" ❁

### ۱۰ اوہام و خرافات کا ابطال

وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ بر اندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرما دیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا:

(( لا عدوی ولا طيرة ولا صفر ولا هامة )) ❁

"نہ چھوت ہے، نہ ہدفالی ہے، نہ پیٹ میں جھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔"

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( العیافة والطيرة والطرقة من الجبت )) ❁

"پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر

حال بتانا شیطانی کام ہے۔"

ایک اور صحابی آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "فال نکالنا شرک ہے۔" پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برائے سمجھتا ہو بلکہ خدا پرست اور سچے رکھنا چاہیے یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "پختہ" (نو) پختہ نہیں۔ ❁ یعنی نبی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو افسانے سن کر آپ ﷺ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا۔ فرمایا:

(( لا غول )) ❁ "غول بیابانی کچھ نہیں۔"

❁ ابوداؤد، کنات الطب، باب فی تعلیق التمام: ۳۸۸۳، ابن ماجہ، کتاب الطب، باب فی تعلیق

التمام: ۳۵۲۰۔ ❁ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الطیرة: ۳۹۱۱، ابن ماجہ، کتاب الطب، باب من کان

یعجبہ الغال ویکرہ الطیرة: ۳۵۳۹۔ ❁ ابوداؤد، کتاب الکھانة والتطیر، باب فی الخط ورجر الطیر: ۳۹۰۷۔

❁ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب من کان یعجبہ الغال ویکرہ الطیرة: ۳۵۳۸۔

❁ ابوداؤد، کتاب الکھانة والتطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۲۔

❁ ابوداؤد، کتاب الکھانة والتطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۳۔

اسی طرح بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورہ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی تصریح تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿ مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ﴾ (۵/ المائدة: ۱۰۳)

”خدا نے بحیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔“

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نہ ہو تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوئی تو ہم رکھیں گے پھر اگر نر مادہ ملے ہوتے تو مادہ کے ساتھ نہ بھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھاٹھانے اور سواری کے لائق ہو سکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا:

یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے

علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر

ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً: بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا

جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹونکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام

عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تعین کے ساتھ

باطل قرار دیا، مثلاً:

① عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند یا سورج میں گرہ بن گلتا ہے، آپ کے صاحب

زادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہ بن لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ انہی کے

مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے جب سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ ”چاند اور سورج خدا کی قدرت کے

مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہ نہیں گلتا۔“ ❁

② یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مار جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

③ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”جاہلیت میں

تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے۔“ لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص

مر جاتا یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ”کسی کے مرنے یا پیدا ہونے

سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔“ ❁

❁ صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب صلوة الکسوف جماعة: ۱۰۵۲۔

❁ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص: ۲۱۸۔

④ شیر خوار بچوں کے سر ہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جن ان کو نہ ستانے آئیں ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ ❁

⑤ نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں قلابہ لٹکاتے تھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلابہ نہ رہنے پائے۔ ❁

الغرض تو حید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو، جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں، چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجے میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

⑩ کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے، جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لیے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

﴿هُؤَلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ﴾ (یونس: ۱۸)

”یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ (الزمر: ۳)

”ہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔“

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھر اتا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے

❁ ادب المفرد، باب الطیرة من الجن: ۹۱۲۔ ❁ مؤطا امام مالک، کتاب صفة السی مرفوعاً، باب ما جاء فی نزح المعالیک والجرس من العنق: ۷۴۲، بخاری: ۳۰۰۵، مسلم: ۲۱۱۵۔

بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿ تَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَجِبَاءُهُ ﴾ (۵/ المائدة: ۱۸)

”ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔“

قرآن نے کہا:

﴿ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلُ حَلْقٍ يُغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ﴾ (۵/ المائدة: ۱۸)

”بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔“

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ نَمَسَّنَا النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۴)

”ہم کو روزِ آخر صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔“

قرآن نے کہا:

﴿ وَعَذَّبْهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتُرُونَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۴)

”اور یہ جھوٹ اپنے دل سے بنا کر جو عقیدہ گھڑ چکے ہیں، وہ ان کے مذہب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔“

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی و طبعی طور سے گناہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ جو وہ زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لیے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغامِ محمدی ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

﴿ اتَّخَذُوا أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ﴾ (۹/ التوبة: ۳۱)

”انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو، خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔“

اور اصولی طور سے اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿ وَمَنْ يَغْفِرْ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳۵)

”خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔“

ان کا عقیدہ تھا کہ بیثباتی قیامت کے دن باپ کے دانہ بازو پر، برابر بیٹھ کر خلق کا عدل و انصاف کرے گا

قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں اس کی تردید کی ہے۔ قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا:

﴿أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأَتَّخِذِ الْهَيْنِ مِنْ دُونِ﴾ (۵/ المائدة: ۱۱۶)

”اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔“

وہ کہیں گے بارالہا! میں نے تو ان سے وہی کہا، جو تو نے کہا: میں نے ان کو یہ تعلیم نہیں دی، میں نے

ان سے یہی کہا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

﴿إِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَعْفُزْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۵/ المائدة: ۱۱۸)

”اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو، تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو

غالب اور حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ اشاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور در ماندہ ہیں:

﴿وَلَا يَلِيكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۸۶)

”یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔“

﴿لَا يَلِيكُمُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا﴾ (۱۹/ مریم: ۸۷)

”یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔“

﴿أَتَّخِذُ مِنْ دُونِهَا إِلَهًا ۖ إِنَّ يُرِيدُ الرِّحْمَنُ بِظُلْمٍ لَّا تَعْنَىٰ شَفَاعَتِهِمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونَ﴾

(۲۳/ یس: ۲۳)

”کیا خدا نے برحق کو چھوڑ کر جو نے معبودوں کو خدا بناواں، اگر رحمن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو

ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چمڑا سکتے ہیں۔“

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا:



﴿وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُرِيدُ﴾ (النجم: ۲۶)

”اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔“

﴿أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلُوبًا لَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ﴾

(الزمر: ۴۳)

”کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کو شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگرچہ یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں)“

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

﴿وَمَا لَأُولَئِكَ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمْ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ﴾

(الانعام: ۹۴)

”اور ہم دیکھتے نہیں کہ تمہارے ساتھ ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔“

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ﴾ ﴿وَكَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ﴾

(الروم: ۱۲-۱۳)

”اور جب قیامت قائم ہوگی، تو مشرکین ناامید ہوں گے، جن کو وہ خدا کا شریک کا بتاتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہو۔“

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

﴿يٰٓبَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾

(البقرة: ۴۷، ۴۸)

”اے فرزندانِ اسرائیل.....! اور ذرا اس دن سے، جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔“

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے:

﴿يٰٓبَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ ﴿وَاتَّقُوا﴾

يَوْمًا لَا تَحْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَذَابٌ وَلَا تَفْعَمُهَا شَفَاعَةٌ ﴿١٢٢﴾

(٢/ البقرة: ١٢٢-١٢٣)

”اے فرزند ان اسرائیل.....! اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔“

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا حِلَّةً وَلَا شَفَاعَةً ۗ﴾

(٢/ البقرة: ٢٥٤)

”اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کرو یا کرو، اس

دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے، نہ شفاعت ہے۔“

غرض آپ ﷺ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور

اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

﴿أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۗ قُلْ أَوْلُوا كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۗ قُلْ لِلَّهِ

الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۗ لَكُمُ الْمَلِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ لَكُمْ إِلَهُ الْيَوْمِ تُرْجَعُونَ ۗ﴾

(٣٩/ الزمر: ٤٣، ٤٤)

”کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں

اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راجح آسمانوں اور

زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹنا جاؤ گے۔“

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں

یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے

حق میں شفاعت کریں گے:

﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۗ﴾

(٤٣/ الزخرف: ٨٦)

”اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں

نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔“

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

﴿لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۗ﴾ (١٩/ مریم: ٨٧)

”یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے چکا ہے۔“

لیکن اس شہادتِ حق اور عبدِ الہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

﴿ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهِ ط ﴾ (۱۰/ یونس: ۳)

”خدا کی بارگاہ میں (کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔“

﴿ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِاِذْنِهِ ط ﴾ (۲/ البقرة: ۲۵۵)

”وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اسکی اجازت سے۔“

﴿ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُرِضٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم: ۲۶)

”اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔“

﴿ اِلَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اٰذَنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ﴾ (۸۷/ النبا: ۳۷)

”یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔“

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَكَ اِلَّا لِمَنْ اٰذَنَ لَهُ ط ﴾ (۳۴/ سبا: ۲۳)

”اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی، لیکن اس کے لیے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔“

﴿ يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اٰذَنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرِضٰى لَهُ قَوْلًا ۝ ﴾

(۲۰/ طہ: ۱۰۹)

”اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اس کے لیے بات کرنا پسند کرے۔“

بلکہ خود انبیاء ﷺ بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی خود خدا چاہے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا يَنْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنْ اٰذَنَ لَهُ وَهُمْ مِنْ خَشِيَّتِهِ مُشْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۲۸)

”اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لیے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور ان

کے خوف سے ترساں ہو گئے۔“

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۗ﴾ (۷۴/ المدثر: ۴۸)

”تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔“

﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ۗ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۱۸)

”اور ظالموں (مشرکوں کا) نہ کوئی دوست اس دن ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔“

اور وہ بد نصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ﴾

(۴/ النساء: ۱۱۶)

”اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔“

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہیں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی اور رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُجْشِرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَاوِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۗ﴾ (۶/ الانعام: ۵۱)

”اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو ہشیار کر دے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے ان کے لیے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔“

﴿مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَاوِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۗ﴾ (۳۲/ السجده: ۴)

”خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔“

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۳) ”بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔“ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء:

خدا کی اس صفت کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عظیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکو کار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً وہ سرِ پارِ رحمتِ نبی جو دنیا میں رحمتِ للعالمین اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

### ۱۱ اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و مہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلافِ موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ (۴۱/ فصلت: ۳۷)

”سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔“

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے:

﴿وَمَا يَهْدِيكُمْ إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (۴۵/ الجاثية: ۲۴) ”ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔“

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ”فلک کج رفتار“ اور ”دہرنا ہنجاز“ کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے ❁ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ”زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے۔“ ❁ اور فرمایا ”خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں وہ تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔“ ❁ یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ اس زمانہ کو برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اس خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پختہ کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پختہ کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی اور صبح کو نماز

❁ فتح الباری شرح بخاری، ج ۸، ص: ۴۴۱ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ۱۱۵۔

❁ صحیح مسلم، کتاب الاقوال من الادب، باب النہی عن سب الدهر: ۵۸۶۶۔

❁ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الجاثية: ۴۸۲۶ و کتاب التوحید: ۷۴۹۱۔

کے بعد حضور صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: ”تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا۔“ صحابہ نے عرض کی، خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔ ارشاد ہوا: ”اس نے فرمایا: آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسنا تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پختھر سے پانی ہم پر برسنا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔“ ❁

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے۔ کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے۔ ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ کے صاحب زادے ابراہیم نے وفات پائی۔ صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک مبلغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا: ”کسوف و خسوف اور گرہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔“ ❁

❁ غیر خدا کی قسم سے روکنا

شکر کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا قریش اپنے دیوتاؤں اور عزی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ❁ لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کی زبان سے لات اور عزی کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ دے یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے۔“ قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو خود اور نہ کسی کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی ❁ ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ اسی

❁ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء: ۱۰۳۸ و کتاب الاذان: ۸۴۶؛ و صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۲۳۱۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الکسوف: ۱۰۴۶۔ ❁ سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف باللات والعزی: ۳۸۰۷۔ ❁ یہ تمام واقعات صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائکم: ۶۶۴۷؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من حلف باللات والعزی: ۴۲۶۰، ۴۲۵۴؛ سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالآباء: ۳۷۹۷، ۳۸۰۶ میں مذکور ہیں۔

طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا: ”کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔“ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ”ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔“

### ۱۵) خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

اکثر لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا توحیدِ کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں۔ عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ ”تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد ﷺ چاہیں۔“ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ ”وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں۔“ یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور محمد ﷺ چاہیں ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔“ ابو داؤد میں یہی تعلیم اس

نسائی، کتاب الایمان والنذور، الحلف بالکعبة: ۳۸۰۔ جامع ترمذی، ابواب النذور والایمان: ۱۵۳۵  
 ومستدرک حاکم، ج ۱، ص ۱۸۰ کتاب الایمان۔ مستدرک حاکم بحوالہ مذکور۔ نسائی، کتاب الایمان  
 والنذور، باب الحلف بالکعبة: ۳۸۰۔ ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب النهی ان یقال ماشاء اللہ وشنت: ۲۱۱۸۔

واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ”یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے۔“ ﴿﴾ لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت، ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلہ کلام میں کہا کہ ”جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں“ ارشاد ہوا کہ ”تم نے خدا کا ہمسرا اور مقابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہیے“ ﴿﴾ ((مَا شَاءَ اللَّهُ وَحْدَهُ))

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مد نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی..... یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا: ”اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو۔“ ﴿﴾ آپ ﷺ نے آزرگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ ”ان دونوں“ کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ..... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں منقول ہے۔

#### ⑭ مشبہات شرک کی ممانعت

جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً: عبدالشمس، عبدمناف ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا: ”بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔“ ﴿﴾ اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔“ ﴿﴾ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شاہنشاہ کہا خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔“ ﴿﴾

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا: ”کوئی شخص

﴿﴾ ابو داؤد، کتاب الادب، ۴۹۸۰۔ ﴿﴾ ادب المفرد امام بخاری، باب قول الرجل: ماشاء الله وشنت:

۷۸۳ و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص: ۱۱۰ مطبوعہ الہ آباد۔

﴿﴾ ابو داؤد، کتاب الادب، باب لا یقال خبثت نفسی: ۴۹۸۱۔

﴿﴾ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء: ۴۹۴۹۔ ﴿﴾ ابو داؤد، کتاب الادب، ۴۹۶۰۔

﴿﴾ مستدرک حاکم، کتاب الادب، باب النهی عن التسمیة بملک الاملاک، ج ۴، ص: ۲۷۵۔



غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا ”بچہ یا بچی“ اور اسی طرح غلام اور بانڈیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب، اللہ ہے۔“ ﴿﴾ ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں۔“ عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں۔“ بولے: شریح، مسلم، عبد اللہ۔ آپ نے پوچھا: ”سب میں بڑا کون ہے؟“ عرض کی: شریح۔ فرمایا: ”تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے۔“ ﴿﴾

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی۔ ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا، شیطان کا برا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر کھسی کے برابر ہو جائے گا۔“ ﴿﴾

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اس کی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومن کی تصویک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

### ۱۵ قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، فطیس مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔“ ﴿﴾ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا: ”خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔“ ﴿﴾

﴿﴾ ابوداؤد، کتاب الادب، باب لا یقول المملوک ربی ورتبی: ۴۹۷۵۔

﴿﴾ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسم القبیح: ۴۹۵۵۔

﴿﴾ ابوداؤد، کتاب الادب، باب لا یقول حبثت نفسی: ۴۹۸۲۔

﴿﴾ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ۱۱۸۸۔

﴿﴾ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور: ۱۱۸۴۔

۱۶) ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے۔ کوئی طلبِ شہرت کے لیے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے۔ ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿ اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْهٰهٗ هُوْلًا ۗ ﴾ (الفرقان: ۴۳)

”تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا۔“

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے اس بت کو توڑنا توحید کی اصلی تکمیل ہے۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دار و مدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے:

﴿ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ﴾

اسی لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر وحی محمدی ﷺ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت مرصاة اللہ اللہ کی خوشنودی ﴿مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ مخلص اور ﴿وَجْهٍ رَبِّهِ الْاَعْلٰی﴾ ذاتِ خدا قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک موقت خدا الگ بنالیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی نہیں، لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے روک دیا، خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی اور خدا ہی کے لیے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔“

متعدد صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ریا چھپا ہوا شرک ہے۔“ حضرت

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے

صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۱۔

ترمذی، ابواب صفة القيامة: ۲۵۲۱، ترمذی کے دونوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اور اس کے ایک راوی حجاج کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔ حضرت ابوسعید خدری، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابوسعید بن ابی فضاہ رضی اللہ عنہم ان صحابیوں کی روایتیں، مسند احمد، ابن ماجہ، متدرک وغیرہ میں ہیں۔

کی موجودگی کے سبب سے کرے۔“ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔“ یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے ”مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں اور جیسی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔“ حضرت محمود بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ ”مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔“ صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ”ریا“ قیامت کے دن جب لوگوں کے اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا خدا ریا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔“ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ”ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا: ”کیا دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟“ ہم سب نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا: ”وہ شرک خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لیے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔“ ابوسعید بن ابی فضاہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”قیامت میں جب خدا انگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا، تو ایک منادی آ کر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے، کہ خدا سناجھے سے بے نیاز ہے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔“

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔ شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمر

- 1 مستدرک حاکم، کتاب الرقاق، ج ۴، ص: ۳۲۹ (صحیح) 2 مستدرک، ج ۴، ص: ۳۳۰؛ مسند احمد  
 مسند شداد بن اوس، ج ۴، ص: ۱۲۶۔ 3 سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الریاء والسمعة: ۴۲۰۔  
 4 مسند احمد حدیث محمود بن لبید انصاری، ج ۵، ص: ۴۲۷۔ 5 سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد،  
 باب الریاء والسمعة: ۴۲۰۔ 6 سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الریاء والسمعة: ۴۲۰۳ و مسند  
 احمد، ج ۴، ص: ۲۱۵۔ 7 ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب الریاء والسمعة: ۴۲۰۲۔  
 8 مستدرک حاکم، کتاب الرقاق، ج ۴، ص: ۳۲۹ (صحیح)

فاروق رضی اللہ عنہ جارہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ”ریا کا ادنیٰ شاید بھی شرک ہے۔“ ❁ اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی اپنی جائے نماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی، میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں! اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ”میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا: ”شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔“ میں نے دوبارہ گزارش کی، یا رسول اللہ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا: ”اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟ فرمایا: ”ہاں۔“ ❁

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

❁ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۳۲۸ (صحیح) ❁ مستدرک حاکم، ج ۳، ص: ۳۳۰، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ ”اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید سزدک ہے“ تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مستند احمد، (ج ۴، ص: ۱۲۶) اور سنن ابن ماجہ، (باب الریاء: ۴۲۰۵) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے، جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لیے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

## توحید

اور

## اس کے ایجابی اصول و ارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزائے تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوت محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو، جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا بت پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب متیقن، سنجیدہ عقائد اور سچائیوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علم الہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سر بھر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا، طہرین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقات کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور ان کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشکلوں، دہریوں،

ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔ ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صالح کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے، ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودت ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے اس بنا پر وحی محمدی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی ایک مغزِ سخن کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا ہے اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدی ﷺ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صالح کائنات کی ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گنہگار قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جن میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کی محسوس ہوتی ہے مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی ان میں نظر نہیں آتی ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيُّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾ (الروم: ۳۰)

”اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ﴾ ﴿۱﴾ ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔“

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمانہ ہے جو خالق و مخلوق میں ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمانہ کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما قبل فی اولاد المشرکین: ۱۲۸۵۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ ؕ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوا بَلٰى ؕ شَهِدْنَا ؕ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۷۲)

”اور جبکہ تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ہاں ہم گواہ ہیں۔“

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو بھارا ہے اور اسی خاستر آگ کو ہوادی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتا ہے:

﴿اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۱۰)

”کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟“

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

﴿اَمْ خَلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ ؕ اَمْ هُمْ الْخٰلِقُوْنَ ؕ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ؕ بَلٰى لَا يُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾

(۵۲/ الطور: ۳۵، ۳۶)

”کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا انہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں۔“

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ بن گئی یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ زرمادہ ل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو سلسلہ تولید و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اولین زرمادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گونا گوں عالم، یہ رنگ رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قومی اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار و خواص و قومی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے:

﴿اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْبَیْلِ وَالتَّهٰكُرِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۹۰)

”آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“  
یہ شب و روز کا نور و ظلمت اور سورج اور چاند کی روشنی اس کی مقررہ رفتار باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اہل حق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۗ﴾ (۴۱/ فصلت: ۳۷)

”اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔“

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فورا ڈوب جائے گا مگر لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے، وہ جس کے حکم سے بنا ہے، اس کا کتنا احسان ہے پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں جا کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہو اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبِكَلِمَةٍ فَبَدَّلَ اللَّهُ مَوْتَهُمْ حَيَاتٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (۲/ البقرة: ۱۶۴)

”بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مردے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر ادھر بدلنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں، ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔“

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:

﴿إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ ۗ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْتِغُونَ مِنْ ذَاتِ بَرَاءَةٍ لَقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۗ﴾ (۴۵/ الحجاثية: ۳، ۴)



”یشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلانے ان میں یقین کرنے والے کے لیے دلیل ہیں۔“

- سورہ انعام میں نباتات اور اس کی نیروگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے، جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک پانی ہے جس سے وہ سنبھلتے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ رنگ کے پھل پھول میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کارنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرَجُ مِنْهُ حَبًّا مَثْرًا كَثِيرًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالزُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ نَظَرُوا إِلَىٰ كُنُوزِهِ إِذَا كُنُوا فِيهَا وَيُنْعَوْهُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكُمْ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ ﴾ (٦ / الانعام: ٩٩)

”اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے ہنر و شے نکالے، جن سے ہم بڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گانھے میں سے نلکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے، جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیل ہیں۔“

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو، اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھ کہ ایک ایک سے الگ ہے پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے:

﴿ وَمِنَ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ وَمِنَ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَلَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ أَلْسِنَتِكُمْ وَاللُّوَاكِمِكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ۝ وَمِنَ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ۝ وَمِنَ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَرْضَ بَرْنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

يَعْقُلُونَ ۝ وَمِنَ آيَاتِهِ أَنْ نَقُومَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ بِأَمْرِهِ ۝ ﴿٢١٠﴾

(۳۰/ الروم: ۲۱-۲۵)

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیارا اور مہر رکھا، اس میں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بولقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہاری رات اور دن میں نیند ہے اور تمہاری اس کی مہربانیوں کی تلاش ہے، اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کے عجایب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم کبھی ڈرتے ہو اور کبھی رحمت کی بارش کی امید باندھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے، اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔“

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں۔ لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر نہ آنے والے کے سہارے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا تو یہ کشش ہی سہی وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جان دار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھرا تا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْأَرْضَ فِي أَلْفَي فِي الْأَرْضِ رَوَايَ أَنْ تَحْيِيَدَ بِكُمْ وَبَكَ فِيهَا مِنْ

كُلِّ دَابَّةٍ ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ۝ ﴿٣١﴾

(۳۱/ لقمان: ۱۰)

”اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے، جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیے کہ وہ تم کو لے کر بل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلانے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کیے۔“

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و متاسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہ کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سَلْمَلَةٍ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۚ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ ۚ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝﴾ (۳۲/ السجدة: ۷-۹)

”وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ذلیل سے نچرے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا، اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔“

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قوتی اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معممہ ہے:

﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۚ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝﴾

(۵۱/ الذاریات: ۲۰-۲۱)

”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تمہارے نظر نہیں کرتے۔“

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے۔ پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص، سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا کتنا کتنا عجیب ہے!

﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نَسَقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِقًا لِلشَّرَابِ ۝﴾ (۱۶/ النحل: ۶۶)

”اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔“

ایک ہی قسم کے پھل ہیں اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسرے طرح کھاؤ تو وہ ان کو ضائع کر دیں۔

﴿وَمِنْ كَمَرَاتِ النَّجِيلِ وَالْأَعْتَابِ تَنْجِذُونَ مِنْهُ سَكْرًا وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (١٦/ النحل: ٦٧)

”اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لیے دلیل ہے۔“

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قدیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسم اور زمانے کو نمایاں کرتا ہے:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾

(٢٥/ الفرقان: ٦١)

”بارکرت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔“

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

﴿صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي أَنْشَأَ كُلَّ شَيْءٍ ط﴾ (٢٧/ النمل: ٨٨)

”اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔“

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے:

﴿مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفْوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ط ثُمَّ ارْجِعِ

الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْتَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَائِسًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ (٦٧/ الملك: ٤٣)

”تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا، کوئی فتور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر، دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی، (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)۔“

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:

① قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

② عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

③ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم عمل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم ودانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان

کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بدایہ دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیے علل و اسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی۔ تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود کو کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اور اصلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے۔ سورہ ہود کے آخر میں ہے:

﴿وَاللَّهُ غَنِيٌّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۗ﴾

(۱۱۱ ہود: ۱۲۳)

”اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوجو اور اس پر بھروسہ رکھو۔“

﴿وَإِن إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ۗ﴾ (۵۳ / النجم: ۴۲)

”اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔“

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آ کر عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا: ”کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟“ گزارش کی، ہاں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ”یہ تو خالص ایمان ہے۔“ مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کا اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا؟ آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟“ فرمایا: ”یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ((أَمِنْتُ بِاللَّهِ)) میں اللہ پر ایمان لایا۔“

یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان: ۳۴۰ میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضاً: ۳۴۳۔

یہ دوسرے لائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہونے نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل پیدا نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو۔ زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا۔ قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَنَّا لِيُصْفُونَ﴾

(۲۱/ الانبیاء: ۲۲)

”اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے، تو زمین و آسمان

برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔“

آسمان و زمین کا یہ تمام کار و بار، یہ تمام توانمین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تضاد میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے۔ اس کی کوئی علت تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو اب عالم کے علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا، تو دوسرے شے علت تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاروں سے لے کر انسان حیوان، ہوا، پانی، درخت گھاس پات تک دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سر مفرق نہیں ہوتا۔ ہر شے اپنے ایک اصول کی پابند اور ایک

عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ إِلَهٍ إِذْ أَنْزَلَ إِلَيْهَا خَلْقَ وَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ ط﴾

(۲۳/ المؤمنون: ۹۱)

”اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔“

﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ إِلَهٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذْ لَا يَتَّبِعُونَ إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يَقُولُونَ عَلٰوًا كَبِيْرًا ۗ نَسْخَرُ لَهُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ (۱۷/ بنی اسراء: ۴۲-۴۴)

”کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے (خدا) اس بات سے، جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔“

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

﴿مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۗ ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرْتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خٰوِسًا وَّهُوَ حَسِيْبٌ ۗ﴾ (۲۷/ الملک: ۳-۴)

”تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فتور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر تھک کر واپس آ جائے گی۔“

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری دلیل نہیں ہو سکتی اسی لیے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدت نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور اوبان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی بنیادی اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں یہ پتھر خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین ہے۔

## خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا۔ اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح ابن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بنی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، ہمیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا، جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ حجر، حجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحرا، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سر بسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے:

﴿ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (۳۹/ الزمر: ۶)

”وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔“

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط﴾ (۳۹/ الزمر: ۶۴)

”آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔“

﴿فَأَطِِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۶/ الانعام: ۱۴)

”آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔“

﴿عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۶/ الانعام: ۷۳) ”چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔“

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ط لَهُ الْعِلْمُ﴾ (۲۸/ القصص: ۸۸)

”اس کی ذات کے سوا، ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔“



﴿ كَيْسَ كَيْفَلُهُ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ الشَّيْبِيُّ الْبَصِيرُ ۗ ﴾ (٤٢/ الشورى: ١١)

”اسکے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔“

﴿ هُوَ الْحَىُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٦٥)

”وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔“

﴿ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يُعَلِّمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَحْرِ وَالْبَعْرُطِ وَمَا تَنْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ

إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَافِظٌ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام: ٥٩)

”غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔“

﴿ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ

وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْغَيْبُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۗ ﴾ (٣/ آل عمران: ٢٦)

”اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے تو ہر بات پر قادر ہے۔“

﴿ وَإِنْ يَسْتَسْكَبُ اللَّهُ بِضَرْفٍ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِيدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَ لِفَضْلِهِ ۗ يُصِيبُ

بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَهُوَ الْعَفُوفُ الرَّحِيمُ ۗ ﴾ (١٠/ یونس: ١٠٧)

”اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی رد کرنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

﴿ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّومُ ۗ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۗ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي

الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۗ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۗ وَلَا يَئُودُهُ

حِفْظُهُمَا ۗ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۗ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٥٥)

”اس اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ

اوکھ آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس

کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے

اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر وہ جو چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔“

﴿يَعْلَمُ مَا يَكْبُرُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ لَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ (٥٧/ الحديد: ٤، ٥)

”جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو، اللہ اس کو دیکھتا ہے، آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔“

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (١/ الفاتحة: ٢)

”سب تعریف اسی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔“

﴿وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الَّذِي قَامَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (٣/ آل عمران: ٨٣)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔“

﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ فَعَالَ لِمَا يُرِيدُ﴾

(٨٥/ البروج: ١٤-١٦)

”وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔“

﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (٦٢/ الجمعة: ١)

”آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔“

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ (١٧/ بنی اسرائیل: ٤٤)

”اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔“

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے ﴿إِنَّا لِلَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور رجب ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ

کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیتا جانتے ہیں، جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں۔ انسانی مخلوقات کو رباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقت میں انسان کے مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کم تر جانتے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورہ میں آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گناہ کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام آسمان کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ ﴿إِنْسِيْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سرخلاف الہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقات الہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔ یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو، نہ زمین کو، نہ پہاڑ کو، صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردن اس بوجھ کے قابل نظر آئی۔ فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاِمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَابْتَيْنَ اَنْ يَّحْمِلَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۗ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۷۲)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔“

وحی محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بنایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے:

﴿ وَاَلْقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۙ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۷۰)

”ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔“

انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے معتدل قوی اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۙ ﴾ (النین: ۴)

”البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔“

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ ❀ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو ❀ کہ وہ صورتِ الہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ ❀ غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا۔ ❀ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے کہ ﴿كَيْسٌ كَوْشِلُهُ شَيْءٌ﴾ (۴۲/ الشوری: ۱۱) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے۔ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ تمام صفاتِ رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت کر رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اسی کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیضِ رحمانی کا موروثی مظاہر کیا۔ ❀ اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے نسبت ہو اس لائق ہے کہ وہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ نکلے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ﴾ (۶/ الانعام: ۱۶۵)

”اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔“

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنا ہے:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲/ البقرہ: ۲۹)

”جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لیے بنایا۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۲/ الحج: ۶۵)

❀ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام: ۶۲۲۷، مسند احمد، ۲/ ۷۵۱: ادب المفرد بخاری لانفل قبح اللہ وجہہ ۱۷۲ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ۶۶۵۵ نیز تورات میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے ”جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا۔“ (پیدائش: ۲۰۵)

❀ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا ضرب العبد فلیجنتب الوجه: ۲۵۵۹، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب اللہی عن ضرب الوجه: ۶۶۵۱ تا ۶۶۵۶۔ ❀ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ: ۶۶۵۵ آخری مگر اصرف مسلم میں ہے۔ ❀ الادب المفرد امام بخاری، باب لا تقبل قبح اللہ وبع: ۱۷۳۔ ❀ اس حدیث کی ثمرت میں فتح الباری شرح بخاری، ج ۵، ص ۱۳۲ میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

”زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔“

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ بیہوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کے لیے بنے ہیں۔ جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لیے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان خدا کے لیے، اس لیے کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں لگنا چاہیے۔

ابروباد ومہ وخورشید و فلک در کارند

تاتو نانہ بکف آری وبہ غفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدی ﷺ نے انسانوں سے کہا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنَّجْمُورَ مَسْخَرَاتٍ بِأَمْرِ رَبِّهِ﴾

(النحل: ۱۶)

”اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم

سے کام میں لگے ہیں۔“

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدی ﷺ نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم ان

کے نہیں ہو:

﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعٌ﴾ (النحل: ۵)

”اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا، تمہارے لیے اس میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔“

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی انہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں:

﴿وَمَوْالِدِي سَخَّرَ لَكُمْ لِيَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَغْرِجُوا مِنْهُ حَلِيَّةً يَتَسَوَّنَهَا وَتَرَى

الْفُلْكَ مَوَازِيحَ فِيهِ وَيَتَّبِعُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾ (النحل: ۱۴)

”اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور، تاکہ تم اس

میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، تاکہ تم

خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو۔“

آگ بھی انسانوں کی معبود بنی حالانکہ وہ خود انہی کی محبت میں جل رہی ہے:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ مِنَ النَّجْوَى الْآخْضِرَ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ﴾

(یس: ۳۶)

”جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔“

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو بھی مخلوق ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور سب اسی کے لیے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور معبود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے؟

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی۔ وہ انہیں دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لیے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرشتہ ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں اور ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔ وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا۔ جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے اور اس سے کیا کیا مانگنا چاہیے اور کیونکر مانگنا چاہیے، اس کے حضور میں دعائیں کیونکر کی جائیں؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک

ذرا بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے، کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں، کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی معبود کرتا ہے کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں، جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا۔ جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا اسکی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار، اس کے مواخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے اور اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر، اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر چا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل ہے، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصد اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

﴿أَلَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَصَلُّبًا الْقَلُوبِ ۗ﴾ (الرعد: ۲۸)

”ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان کی دولت ملتی ہے۔“

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر

حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار ہو گئے:

﴿يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۱)

”وہ خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔“

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارا زل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (۲۴/ النور: ۳۷)

”وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔“

ان کی محبت الہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا۔ خدا نے ان کی توصیف کی کہ

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۶۵)

”ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔“

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی و صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمان کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (۶۵/ الطلاق: ۳)

”جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے، تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔“

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا﴾ (۳۹/ الزمر: ۳۶)

”کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔“

﴿وَسَخَّطِى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْضَعَهُ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۷)

”اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔“

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء و صفات

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رہی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصول منطقی کی بنا پر ذرات اور حقائق کے ذریعہ سے



اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حدِ منطقی) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکنجیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ علم ہے تو دراء اللوراستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اس رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفاتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام کی ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک نا آشنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعی بیگانہ تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ ”الرحمن“ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں۔ اصحاب ائیل کے رئیس عیسائی ابرہہ کے نام سے سدِ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ ”رحمن“ کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعرا کے کام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑا ہو گئی تھی، اسی لیے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ”قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمن کیا ہے؟“ \* محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمن کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمن کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿وَأَذِيقِلْ لَهُمُ الْمَسْجِدَ وَاللِّزْحَمِ قَالَ أُوْمَا الرَّحْمٰنُ ۚ اَسْجِدْ لِمَا كَانُوْنَ اَزَادَهُمْ نُفُوْرًا﴾

(۲۵ / الفرقان: ۶۰)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمن کیا ہے، کیا تم جس کو کہا اس کو ہم سجدہ کریں، رحمن کا نام ان کی نفرت اور بڑھادیتا ہے۔“  
مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمن کی مدح و ستائش کرتے ہیں:

\* صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد و المصالحة مع اهل الحرب و کتابة الشروط

﴿ اِهْدَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ ۗ وَهُمْ يَذْكُرُونَ الرَّحْمٰنُ هُمْ كٰفِرُونَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۳۶)

” (مشرک آپ کو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔“

تعلیم محمدی نے عرب کے ناآشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوْ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۗ اَيًّا مَّا تَدْعُوْنَ فَلَهُ السَّمَاوَاتُ الْحُسْنٰى ۗ ﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ”یہوا“ تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام ”امیم“ ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان کے علاوہ اس کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفات الہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والے خداوند یعنی رب الافواج کا لفظ ہے جو اس کی صفات جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ”باپ“ کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھتے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپالیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے قائم بننے کا خالق (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باپ، حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفات الہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے

تمام مذاہب اسی تحسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، ہمیش، وشنو، تین صفات خالق، ہمیت (مارنے والا) اور قیوم کے تحسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی، شکر آ چار یہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کیے، حیات، علم اور سرور یا آند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تحسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلق دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی شویت اور دوئی بھی، خدا کی دو صفتوں، ہادی اور مصل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہائیں، آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی: ”اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے، جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا، تعلیم ہوئی: ”خداوند! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔“ ﴿قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا:

﴿قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدادًا لَكَلِمَتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَعْرُ قَبْلَ أَنْ نُنْفِذَ كَلِمَتُ رَبِّي وَكُلُّ جَنَّةٍ

بِوَسِيلَةٍ مَّكْدًا﴾ ﴿١٨ / الکہف: ۱۰۹﴾

”کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔“

دوسری جگہ کہا گیا:

﴿وَكُلُّوْا نَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَوْ اَقْلَامٍ وَّالْبَعْرُ يُّدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةَ اَمْجُوْا مَا نَفَذَتْ

كَلِمَتِ اللّٰهُ﴾ ﴿٣١ / لقمان: ٢٧﴾

”اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم ہو جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔“

• بیہتوں دعا میں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات، باب البیان ان للہ جل ثناہ اسماء اخر، ص: ۴-۵ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۹۱ میں بھی (مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما) ہے۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾ (طہ: ۸)

”نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ، اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔“

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

﴿قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۗ﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”کہہ دے (اے پیغمبر!) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر، جو چاہے کہہ کر پکارو کہ سب اچھے نام اسی کے ہیں۔“

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو، جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اسکو یاد نہ کرو:

﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ ۗ﴾

(۱۸۰/ الاعراف: ۱۷)

”اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔“

تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ اس کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے:

﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ مَثَلُ نُورِهِ كَمِثْلَةِ نَوْءٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ۗ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ۗ

الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ ۗ يَكَادُ

زَيْتُهَا يُضِيءُ ۖ وَكُلُّ لَمَسَةٍ نَارٍ ۗ نُورٌ عَلَى نُورٍ ۗ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ

الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝﴾ (۲۴/ النور: ۳۵)

”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب ہے نہ وہ پچھتم ہے، اس کا تیل

اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔“

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۗ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۗ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۗ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ (٢/ البقرة: ٢٥٥)

”اللہ نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود، وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے، اس آسمان اور زمین کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔“

﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۗ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ أَلْهَكَ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُبِينُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۗ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۗ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۗ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (٥٩/ الحشر: ٢٢-٢٤)

”وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا، وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی امن والا، ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، بنانے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔“

﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۗ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ يُهَيِّئُ وَيُؤَيِّتُ ۗ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۗ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۗ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۗ يَعْلَمُ مَا يَكْتُبُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَرْجِعُ فِيهَا ۗ وَهُوَ

مَعْلَمٌ اِنَّ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ ﴿۱﴾ لَكَ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲﴾ يُوَلِّجُ الْاَيْلٰنَ فِي النَّهَارِ وَيُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي الْاَيْلٰنِ ۗ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذٰتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳﴾

(۵۷/ الحدید: ۱-۶)

”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے، وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمان کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے، اور جو زمین میں سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے اسی کی آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔“

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے جب توحید کا آواز بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آل و اولاد اور بیویوں اور گویوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی: ﴿

﴿۱﴾ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۲﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۳﴾ لَمْ يَلِدْ ﴿۴﴾ وَاَلَمْ يُولَدْ ﴿۵﴾ وَاَلَمْ يَكُنْ لَهٗ لَفْوَ اَحَدٌ ﴿۶﴾

(۱۱۲/ الاخلاص: ۱-۴)

”کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جاننا ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے کوئی ماں باپ ہیں، (جنہوں نے اس کو جانا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسرہ ہے (جو اس کی بیوی ہو)۔“

یہ روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ”صمد“ وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنتا ہو کیونکہ جو جنتا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا

﴿۱﴾ مستدرک حاکم، تفسیر سورۃ اخلاص (صحیح) ج، ۲، ص: ۵۴۰ وجامع ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۳۶۴ و کتاب الاسماء بیہقی ابواب ذکر الاسماء التي تتبع نفی التشبیہ، ص: ۲۳ (الہ آباد)

ہے اور خدانہ مرتا ہے نہ اسکا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے۔“ غور کر دو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ ذلیل تکتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا، جس کا اندازہ حضرت ابی ذرؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ ”خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔“ \* حضرت ابو ہریرہؓ یعنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد جو تعلیم محمدی سے پہلے ان تھاقق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ و تقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ”صمد“ کا ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ ”صمد“ کے معنی لغت میں اونچی پتھر ملی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر دخول نہ ہو، اس لیے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ”صَمَدٌ“ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صمدہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہودہ شریف جس کی شرافت کمال ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ دربار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پروا ہے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی کامل کے درجہ تک ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔“ \*

\* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة اخلاص: ۴۹۷۵۔

\* کتاب الاسماء والصفات، امام بیہقی ص: ۴۳۔

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصری رضی اللہ عنہ: وہ جی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انس رضی اللہ عنہ: جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہ رضی اللہ عنہ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہ و شععی: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ: جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قنادہ رضی اللہ عنہ: باقی، غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معنی \* اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، تاہم اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۲-۳۱-۳۰) میں ہے۔

”اگر ان کی چٹان ان کو بچ نہ ڈالتی اور خداوندان کو اسیر نہ کروا تا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں

جیسی ہماری چٹان۔“

”یہ چٹان“ اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے۔ سوال کے پہلے صحیفہ

میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے ”خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں تیرے سوا کوئی نہیں،

کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں۔“ (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو (۲) لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو متضاد

کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی

سے غرض۔ وہ یکتا و تنہا، اکیلا بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال

یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع،

سب کا ماویٰ، سب کا بلجاء یعنی سب کی چٹان، مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تسفی ہے۔

﴿فَقَرُّوا إِلَى اللَّهِ﴾ (۵۱/الذاریات: ۵۰)

”ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔“

\* ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بھقی، ص: ۴۳، مفردات القرآن راغب اصفہانی، ص: ۲۸۸ ابن جریر

طبری، جز ۳۰، ص: ۱۹۶، ۱۹۷، ابن کثیر، ج ۴، ص: ۵۷۰ اور تفسیر سورۃ اخلاص لابن تیمیہ، ص: ۳۔



یہ سورہ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قراءت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ ✽ ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا، مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا: ”یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔“ ✽ قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ صحابی تھے، جو رات بھر اس ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا: ”یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔“ ✽ اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔“ ✽ آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے۔ پورے سو کیوں نہ مقرر کیے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی ابواب الدعوات میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے۔ لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ ”یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔“ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اسی لیے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب

✽ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء في دعاء النبي ﷺ أمته الى التوحيد: ۷۳۷۵۔

✽ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجمع بين السورتين في ركعة: ۷۷۴۔

✽ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۵، ۲۳۔

✽ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب مقلب القلوب: ۷۳۹۲ و صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب اسماء اللہ تعالیٰ و فضل من احصاها: ۶۸۰۹ و مسند احمد، ج ۲، ص: ۲۵۸ و جامع ترمذی: ۳۵۰۶، نسائی: ۱۶۷۶۔

راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے، اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الہی ان ننانوے میں محدود ہے۔ بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً: عبد العزیز بن محیی، ابو بکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی رحمہم اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الہی کی کوئی حد و پاباں نہیں ہے ﴿ اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یا وہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزه اور پاکیزہ ہے۔ علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شائشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے، ہم ان کو صفات جمالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تزیہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تزیہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفات جمالی: یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے:

اللہ: یہ خدا کا نام ہے جو قرآن پاک میں بطور خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں ”خدائے برحق“ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

الرَّحْمَنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے۔ جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔

تمہید ابی شکور سالمی الباب الخامس القول الثالث فی عدد الاسماء، ص: ۶۱ یہ ماریڈیک مشہور مستند کتاب ہے۔

یہ گزر چکا ہے کہ رَحْمَن کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرَّحْمَن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے۔ مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رَحْمَن دو اجنبی صفتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۗ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۗ ﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”اللہ کہو یا رَحْمَن کہو، جو چاہے کہو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔“

الرَّحِيمُ: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے۔ جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مرہبانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرَّحْمَن اور الرَّحِيمِ خدا کی دو صفتیں ہیں۔ جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہو گا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی انہیں دو صفتوں کا ظہور ہے۔ اس عالم اور اس عالم دونوں میں اس کی انہیں دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہو گا۔

الرَّحْمَنُ: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

الرَّحِيمُ: لطف والا مرہبان۔

الرَّحِيمُ: معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

الرَّحِيمُ: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

الرَّحِيمُ: امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

الرَّحِيمُ: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

الرَّحِيمُ: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الرَّحِيمُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

الرَّحِيمُ وَالرَّحِيمُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

الرَّحِيمُ وَالرَّحِيمُ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، نگہبانی کرنے والا، بچانے والا۔

الرَّحِيمُ: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

الرَّزَاقُ وَالرَّزَاقُ: روزی دینے والا، نشوونما کا سامان، بہم پہنچانے والا۔  
الْوَالِيُّ: دوست، ہمتی، طرفدار۔

الرَّءُوفُ: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔  
الْمُقْسِطُ: انصاف والا، عادل۔

الْهَادِيُّ: راہ دکھانے والا، رہنما۔  
الْكَافِيُّ: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

الْمُجِيبُ: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔  
الْحَلِيمُ: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

التَّوَابُ وَقَابِلُ التَّوْبِ: توبہ قبول کرنے والا، گناہگار کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الْحَنَّانُ: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔  
الْمَنَّانُ: احسان کرنے والا۔

النَّصِيرُ: مدد کرنے والا۔  
ذُو الطُّوْلِ: کرم والا۔

ذُو الْفَضْلِ: فضل والا۔  
الْكَفِيْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الْوَكِيْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔  
الرَّوْضِيُّ: روزی پہنچانے والا۔

الْمُعِيْثُ: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔  
الْمُجِيْبُ: پناہ دینے والا۔

الْمُعِيْنُ: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔  
صفاتِ جلالی:

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے:

الْمَلِكُ وَالْمَلِيْكُ: بادشاہ، فرمانروا۔

الْعَزِيْزُ: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

الْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

الْمُنْتَقِمُ : مزادینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔  
 الْجَبَّارُ : جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سر تابی نہ کر سکے۔  
 الْمُهَيِّمُنُ : سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔  
 الْمُتَكَبِّرُ : اپنی بڑائی دکھانے والا، کبر یائی والا، سخت مزادینے والا۔  
 شَدِيدُ الْعِقَابِ : سخت سزا والا۔  
 شَدِيدُ الْبَطْشِ : بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔ لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لا ابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے۔ بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جوش بہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَيَسَّ يَظْلَمُ الْوَالِدِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۲)

”بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔“

اس لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ ساتھ ہی کہا گیا ﴿ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ (۳۸/ ص: ۶۵-۶۶) تو مومن کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا گیا:

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰبَادِ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۳۱)

”اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔“

اس کی صفت ﴿ ذُو عَقَابٍ اِيْمٍ ﴾ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے معاف پہلے ﴿ لَذُوْا مَغْفِرٍ ﴾ (۴۱/ ختم السجدة: ۴۳) یقین بخشش والا بھی فرمایا گیا۔ غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے اس کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی: وہ اسماء و صفاتِ جن سے اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر صف میں اس کا کامل ہونا ظاہر

ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔ دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تزیین اور پاکی سے۔

☆ صفات وحدانیت: یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

الْوَّاحِدُ: ایک۔

الْأَحَدُ: ایک۔

الْوَتْرُ: طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

☆ صفات وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

الْمَوْجُودُ: وجود والا، ہست۔

الْحَيُّ: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

الْقَدِيمُ: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو، جو ہمیشہ سے ہے۔

الْقَيُّومُ: جو اپنے سب سے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الْبَاقِيُ: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الذَّائِمُ: ہمیشہ رہنے والا۔

الْأَوَّلُ: وہ پہلا جس سے پہلے کوئی نہیں۔

الْآخِرُ: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

الْمُقَدِّمُ: جو سب کے آگے سے ہے۔

الْمَوْخِرُ: جو سب پیچھے رہ جائے۔

الظَّاهِرُ: جس کا وجود دکھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

الْبَاطِنُ: جو چھپا اور مخفی ہے۔ (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

☆ علم: وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں:

الْخَبِيرُ: خبر رکھنے والا۔

الْعَلِيمُ: جاننے والا۔

عَلَامُ الْغُيُوبِ: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السَّمِيعُ: سُننے والا۔

- دیکھنے والا۔ : **الْبَصِيرُ**
- بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کا ظاہر کرنے والا۔ : **الْمُتَكَلِّمُ**
- پانے والا، جس کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔ : **الْوَاجِدُ**
- حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔ : **الشَّهِيدُ**
- حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔ : **الْحَسِيبُ**
- گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی اعداد کا بھی جاننے والا۔ : **المُحْصِي**
- تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔ : **الْمُدَبِّرُ**
- حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔ : **الْحَكِيمُ**
- ارادہ کرنے والا، ہشیت والا۔ : **الْمُرِيدُ**
- نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔ : **الْقَرِيبُ**
- یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے: ☆ قدرت : **قُدْرَتُ**
- ہر مشکل کو کھولنے والا۔ : **الْفَاتِحُ وَالْفَاتِحُ**
- قادر، قدرت والا۔ : **الْقَادِرُ وَالْقَادِرُ**
- اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چوں و چراں نہیں کر سکتا۔ : **الْمُقْتَدِرُ**
- زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ : **الْقَوِيُّ**
- مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔ : **الْمَتِينُ**
- جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔ : **الْجَامِعُ**
- اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔ : **الْبَاعِثُ**
- سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔ : **مَالِكُ الْمَلِكِ**
- نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔ : **الْبَدِيعُ**
- سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔ : **الْوَاسِعُ**
- جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی اس کے احاطے سے باہر نہیں۔ : **الْمُحِيطُ**
- جلانے والا اور مارنے والا۔ : **الْمُحِي وَالْمُمِيتُ**
- سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔ : **الْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ**
- عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔ : **الْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ**

النَّحَافِضُ وَالرَّافِعُ : نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔  
 الْمُعْطَى وَالْمَنَعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔  
 النَّبْعُ وَالصَّارُ : نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع و ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔  
 الْمُبْدِي وَالْمُعِيدُ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے۔ جیسے الصَّارُ (نقصان پہنچانے والا) الْمُبْدِي (ذلت دینے والا) النَّحَافِضُ (پست کرنے والا) الْمَنَعُ (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف الصَّارُ، النَّحَافِضُ، الْمَنَعُ اور الْمُبْدِي کہنا درست نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی الصَّارُ کے ساتھ النَّبْعُ، النَّحَافِضُ کے ساتھ الرَّافِعُ، الْمَنَعُ کے ساتھ الْمُعْطَى اور الْمُبْدِي کے ساتھ الْمُعْزُ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث و دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان و نفع پہنچانے والا، عزت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا کہ اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے کہ اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبور و مضطر ہونا لازم آتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نمایاں نہیں ہوتا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تشریح یہ: وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پائی اور نیکی اور ہر عیب اور نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

الْغَنِيُّ : بے نیاز : الْكَافِرُ : سچا، راست باز  
 الْعَلِيُّ : مرتبہ والا : الْعَمَلُ : عزت والا  
 الْعَظِيمُ : عظمت والا : الْحَمِيدُ : تعریف والا  
 الْكَبِيرُ : بڑا : الْقُدُّوسُ : پاک  
 الْكَرِيمُ : بلند : الْحَقُّ : سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔  
 الْجَلِيلُ : بزرگ : الْجَمِيلُ : اچھا



الْعَدْلُ: عادل      الْبُرُّ: نیک  
الْكَرِيمُ: شریف      سُبُوْحٌ: ہر عیب سے پاک  
الْصَّمَدُ: جو بزرگی کی ہر صفت میں کامل ہے۔      الْوَرَثِيْدُ: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامد و اوصاف، اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں کہ وہ بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لیے قابلِ نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء و صفات کو محامد و محاسن اور خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ محامد الہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے، اس لیے انسان کو بھی اپنے اور ہر حرف کے لکھنے (محامدِ الہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر بھی ڈال لینا چاہیے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بچکم:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ﴾ (البقرة: ۳۰)

”آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔“

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا اتحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا۔ جب وہ سر تا پا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا:

﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۗ﴾ (البقرة: ۱۳۸)

”خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے؟“

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ”خدائی رنگ“ سے مقصود خدا کا ”دینِ فطرت“ ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ((إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُوْرَتِهِ)) ﴿﴾ ”خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی

صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام: ۶۲۲۷۔

صلاحت عطا کی ہے اور ان میں انسانی حد تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق و صفات میں ملائے اعلیٰ سے تہہ اور ہم شکل کا جو ہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ کا کہ

”تخلقوا باخلاق اللہ۔“ ”خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔“

مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

((حسن الخلق خلق اللہ الاعظم)) ”حسن خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔“ ❁

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی، تہذیبی، کمالی اور جمالی، صفات جلالی جن میں کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، خالق تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اسی لیے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیے آدمی جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا، دایگی لعنت کا مستحق ٹھہرا:

﴿أَلَىٰ وَاسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (البقرة: ۳۴)

”اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا، اور کافروں میں سے ہو گیا۔“

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

﴿وَالَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝﴾ (العنكبوت: ۳۷)

”اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔“

صحیح مسلم ❁ میں ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما و صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔“ دوسری جگہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”خدا کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔“ ❁

﴿الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمَتَكَبِّرُ ۝﴾ (الحشر: ۲۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوت حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر

❁ کنز العمال، ج ۲، ص: ۴ بروایت عمار بن یاسر۔

❁ کتاب البر والصلة، باب تحريم الكبر: ۶۸۰۔ ❁ صحيح بخارى، كتاب الادب، باب ابغض الاسماء

الى الله تبارك وتعالى: ۶۲۰ و مسلم، كتاب الآداب، باب تحريم التسمي بملك الاملاك: ۵۶۱۰، ۵۶۱۱۔

نیاز اظہار بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۶۳/ المنافقون: ۸)

”اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔“

حاکم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہو معزز بنا چاہتا ہے تو وہی شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا ”اس کا مزہ چکھو تو معزز اور شریف بننا تھا۔“ (۴۳/ الدخان: ۴۹) ”اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے۔“ کہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔ ❁

خدا کے صفات کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازل وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقید اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفات تنزیہی، مثلاً: قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گناہ گاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔ صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے۔ عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ ”خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر۔ جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں۔“ اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان! تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔“ ❁ قرآن کہتا ہے کہ ”تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔“

﴿إِنْ تُبَدَّوْا خَيْرًا أَوْ تُخَفَّوْا أَوْ تُعَفَّوْا عَنْ سَوْءِ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا﴾

(۴/ النساء: ۶۴۹)

”اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر رو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے

والا، قدرت والا ہے۔“

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ مگر اس منظر کو دیکھ کر حضور ﷺ کے چہرہ کا، رنگ متغیر تھا ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا: ”امام تک معاملہ پہنچنے سے

❁ کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۰۹؛ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، سورة دخان، ج ۲، ص: ۴۵۱۔

❁ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۸۔

پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور غنود درگزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“ ❁

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ ”جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہو گا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔“ ایک صحابی نے عرض کی، یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا:

((ان الله عز وجل جميل يحب الجمال)) ❁

”اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔“

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانے ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ”خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔“ ❁ یہ روایت بھی ہے: ”خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔“ ❁ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ”وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بد اخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔“ ❁ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت فرماتے ہیں: ”اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔“ ❁ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ”لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔“ ❁ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔“ ❁

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔“ ❁ رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا

- ❁ مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۳۸۲، کتاب الحدود۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ: ۲۶۵؛ ترمذی، ابواب البر و الصلۃ، باب ما جاء فی الکبر: ۱۹۹۹۔
- ❁ کنز العمال کتاب الزینۃ، ج ۳، ص ۳۲۶ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔ ❁ کنز العمال کتاب الزینۃ، ج ۳، ص ۳۲۶، بحوالہ کامل لابن عدی۔ ❁ ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔
- ❁ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام: ۵۶۵۶؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الرفق: ۴۸۰۸؛ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب الرفق: ۳۶۸۹۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب: ۲۳۴۶؛ ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورة البقرة: ۲۹۸۹۔
- ❁ ابوداؤد، کتاب الوتر: ۱۴۱۶۔ ❁ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمة: ۴۹۴۱۔

گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”رحم کی جڑ رحمن سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کر دوں گا۔ جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔“ ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے: ”میں خدا ہوں، میں رحمن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمن) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کر دوں گا۔“ پھر فرمایا: ”جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔“ بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں: ”جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا نے رحم کے سو حصے کیے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے لیے اس خوف سے پاؤں اٹھالیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔“

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنی تھیلی کے منہ بند کر دو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔“ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ”جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔“ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ”جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔“ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں۔ اسی لیے اس نے نحش باتوں کو حرام کیا ہے۔“

اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا ”کہ خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت یہی ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر نفا ہو۔“ ﷻ اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

﴿وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَالِمٍ لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۲)

”اور خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله اللہ: ۵۹۸۸، ۵۹۸۹۔

ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی قطیعة الرحم: ۱۹۰۷۔ صحیح بخاری، ابواب البر والصلۃ،

باب ماجاء فی رحمة الولد: ۱۹۱۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷۔

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللہ الرحمة فی مائة جزء: ۶۰۰۰۔ جامع ترمذی، ابواب

البر والصلۃ، باب ماجاء فی السخاء: ۱۹۶۰۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۸۔

ابو داود، کتاب الادب باب فی المعونة للمسلم: ۴۹۴۶۔

صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرة: ۵۲۲۰۔

جامع ترمذی، ابواب الرضاع باب ماجاء فی الغیرة: ۱۱۶۸۔

((يا عبادى انى حرمت الظلم على نفسى وجعلته بينكم محرما فلا

تظالموا)) ❁

”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔“

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک و صاف رہنا چاہیے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان اللہ طیب يحب الطيب ونظيف يحب النظافة فتتظفوا ولا تشبهوا

اليهود)) ❁

”خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک و صاف ہے پاک اور صفائی کو پسند کرتا ہے،

تم پاک و صاف رہا کرو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔“

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل (ومصر) ہندو ایران کے خدا اور ’ربکم الاعلیٰ‘ ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل و نصب و یوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف و ذلیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پر میثور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ، اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی، جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و نفرت کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آکر اس اونچائی، نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی

❁ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۱۶۵۷۲ مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۶۰ وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ظلمات: ۴۹۰۔

❁ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی النظافة: ۲۷۹۹۔

بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحات میں ثبت ہیں اور بالآخر اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا۔ جو حقیقی توحید سے نا آشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساوات انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تقادوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا۔ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی وہ نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرانگندہ ہیں، دولت و فقر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۗ ﴾ (۴۹ / الحجرات: ۱۳)

”تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔“

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیے۔ اس کے گوشہ چشم میں لطف و عنایت کا گز نہیں۔ محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں۔ نہ وہ اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اپنے لیے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات اوپر گزر چکے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عام کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم، رحمت اور مہربانی کی جگہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجوہات کے سبب مغالطہ ہوا:

- ① آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔
- ② دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت، یہ دونوں

جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز و تہمت اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر عنایت و اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبہ سے ہو سکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تنہا خوف سے ہو سکتا ہے اور نہ تنہا محبت سے انجام پاسکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے اور یہی نبوت محمدی ﷺ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سر تا پا خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا نوجوں کا سپہ سالار \* اور باپ کا بدلہ پشت پاشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ \* حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ \* اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی تو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہیں۔ بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔ \* مگر ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطہ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی السلیعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد ﷺ کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے:

﴿ اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ ۗ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ

اِصْلَاحِهَا وَاذْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۗ اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْهٰخِسِيْنَ ۝ ﴿۷﴾

(۷/ الاعراف: ۵۵، ۵۶)

” (لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل و کرم کی لو لگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام

\* سیر میاہ ۲۲، ۱۴، ۱۵ وغیرہ۔ \* خروج ۲۰، ۵، ص: ۱۱۹ و ۳۴، ۷ و استثناء ۴، ۳۴، ۷: ۱۴۴

استثناء: ۴، ۳۲، ص: ۲۸۵، ۶، ۱۵، ص: ۲۸۹، ۲۹۰ وغیرہ۔ \* خروج ۲۰، ۷: ص: ۱۱۹ و ۳۴، وزبور

۱-۵۶، ص: ۸، ۱۰، ۱۳، ۸، ص: ۴، ۱۵۰، ۱۰۳، ۸، وغیرہ میں خدا کے پیارا اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔

\* لوقا کی انجیل ۱۲، ۵، ص: ۱۱۷ اول پطرس ۱۷، ص: ۳۷۷ دوم قرینثون ۷-۱، افسیون ۲۱، ۵، ص: ۱۱۳۱۷ الفرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم

عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔



کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔“

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

﴿إِنَّهُمْ كَأُولَىٰ مُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْ عُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۹۰)

”وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔“

اس سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں

بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿وَأَخْيَرَىٰ الرَّحْمَنِ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۶/ یس: ۱۱)

”اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔“

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۱/ ق: ۳۳)

”اور جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔“

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں:

﴿وَأَخْشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ﴾ (۲۰/ طہ: ۱۰۸)

”اور رحم والے کے اوب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔“

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا۔ اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً: حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دوسرے وہ جو محبت الہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانہ عشق کی طرف بلاتے تھے۔ مثلاً: حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی۔ جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال و دونوں کا مظہر اور پیار اور اوب و لحاظ دونوں کی جامع تھی۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الہی سے اشک بار رہتی تھیں دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ ﷺ کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و دلولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ ❁

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے

گرنے کا خطرہ ہے۔ خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کے شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ((الایمان بین الخوف والرجم)) ”ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔“ کہ تمہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ لوگوں کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۶)

”اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔“

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن ﷺ نے ان الفاظ میں کی:

((رحمتی سبقت غضبی)) ❁

”میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔“

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزند الہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیر علیہ السلام کو فرزند الہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لاکھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

﴿مَنْ آتَى اللَّهَ وَآجِبَاؤُهُ ط﴾ (۵/ المائدہ: ۱۸)

”ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔“

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ط بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلَ حَاقِقٍ ط﴾ (۵/ المائدہ: ۱۸)

”اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، (اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔“

دوسری جگہ قرآن نے تمہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنْكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَتَّوْا الْبُوتَ إِنْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝﴾ (۶۲/ الجمعة: ۶)

”اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا

کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔“

اسلام رحمتِ الہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برابری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ ”خدا یا مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا: ”خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔“ \* ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدا یا مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ”یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔“ \*

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیم محمدی ﷺ سے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں۔ جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شوکی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شوکی اصطلاح سے ادا کیا گیا، ”سدا سہاگ“ فقرہ اس تخیل کی مصححہ انگریز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرتے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظ کی

\* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبیہائم: ۶۱۱۰؛ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الدعاء فی الصلوٰۃ: ۸۸۲؛ مسند امام احمد، ج ۲، ص: ۱۷۰، ۱۷۱۔

\* ابوداؤد، کتاب الادب، باب من لیست له غیبة: ۴۸۸۵؛ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۲۴۸۔

اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے مائوں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساریاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا۔ ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے:

﴿فَأَذْكُرُوا لِلَّهِ كُنُوزَكُمْ أَنْكُمْ وَأَنْتُمْ أَكْثَرُ﴾ (البقرة: ۲۰۰)

”تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔“ دیکھو کہ باپ کی طرح محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ ان کے تمام خیالات و تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منظر اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ”ان دیکھی ہستی“ کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اس لیے نبوت محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک

قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے۔ اس لیے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لے لیا اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کے استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔ ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گوان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور عَلم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے۔ مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَاوَلَاہُ سے نکلا ہے اور وَاوَلَاہُ کے اصل معنی عربی میں اس ”عَمَّ مَحَبَّت“ اور ”تعلق خاطر“ کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق ”عشق و محبت“ کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والد (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ (من موہن) یعنی ”دلوں کا محبوب“ کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رَحْمَن اور رَحِيم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ”رحم والا“ ”مہربان“ لطف و کرم والا ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربانی کے بار بار ہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رَحْمَن ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے:

﴿قُلْ اِدْعُوا اللّٰهَ اَوْ اِدْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ؕ﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”اس کو ”محبوب“ (اللہ) کہو یا ”مہربان“ (رحمن) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی

کے ہیں۔“

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی صد بار بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمن کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الہی کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۃ ذات البروج میں) آیا ہے، جس کے معنی ”محبوب“ اور ”پیارے“ کے ہیں کہ وہ سر تا پا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔ اس کے سوا خدا کا ایک اور نام اولیٰ ہے جس کے لفظی معنی ”یار“ اور ”دوست“ کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ ”الرؤف“ ہے ”رؤف“ کا لفظ ”رافت“ سے نکلا ہے ”رافت“ کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حنان ”حن“ سے مشتق ہے ”حن“ اور ”حنین“ اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت اور جسمانیات کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے۔ یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا، وہ سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سر تا پا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مؤمن (امن دینے والا) ہے۔ وہ العدل یعنی سر تا پا انصاف ہے، وہ العفو (معاف کر نیوالا) ہے۔ الوہاب (عطا کرنے والا) الحلیم (بردبار) الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے خالص پر رجوع کر نیوالا) البسر (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل ہے) ان میں ہر لفظ پر پٹھہر کر ڈرنا نور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار، انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو دہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقتے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلطی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو

اصلیت سمجھ کر پاک اور سر تا پا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ منکلم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعارات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق و محبت کے ان دلاویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، باایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب باپ کی بجائے ”رب“ کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

”اَبٌ اور رَبٌّ“ ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطَّح نظر سے کس درجہ پست ہے، اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر، پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ بچپن کے ایک محدود حصے تک قائم رہتا ہے، اس طرح گویا باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد و درجہ ناقص، محدود، اور فانی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریات زندگی، سامانِ حیات، نشوونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل، اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی، بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فناء محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھا رہتا ہے انسان ذرہ ہو، یا بصورت غذا، قطرہ آب ہو، یا قطرہ خون، مضافہ گوشت ہو یا مشیت استخوان، شکم ماور میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے ماویت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے،

اس سے لفظ ”رب“ ایک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے بیروشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ نجانہ آلسنت کی سرشاری کی یاد دہکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت ”حب الہی“ ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبان الہی نے شہادت دی:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۶۵)

”جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔“

اس نشہ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان و مال، خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ (۹/ التوبة: ۲۴)

”اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا رکنہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔“

ایمان کے بعد بھی اگر نشہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جاہد حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾

(۵/ المائدة: ۵۴)

”مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں،

وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔“

حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا: ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔“ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری

آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے۔ مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمہ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو



کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوے دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں، اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

﴿إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَأَتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (۳/ آل عمران: ۳۱)

”اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔“  
محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ اللَّهُ رِزْقًا وَسَعَةً﴾

(۱۹/ مریم: ۹۶)

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے رحمت والا خدا، ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔“

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دو بتائے گئے ہیں ایمان اور عمل صالح، یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۵/ المائدة: ۱۳)

”خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ﴾ (۲/ البقرة: ۲۲۲)

”خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵۹)

”خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۵/ المائدة: ۴۲-۴۹/ الحجرات: ۹)

”خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (۹/ التوبة: ۴)

”خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ﴾ (۶۱/ الصف: ۴)

”خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۶)

”اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾ (۹/التوبة: ۱۰۸)

”اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔“

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے، جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان کو جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔“

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کائنات سا چھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و در ماندہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والد و شیدائیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن: اران کا نٹوں سے پاک و صاف ہوگا:

﴿الْإِنِّ أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۱۰/یونس: ۶۲)

”ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

محبت کا جو جذبہ بڑے کوچھونے کے ساتھ احسان، نیکی، درگزر اور غنود بخشش پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا نام ”رحم“ اور ”رحمت“ ہے اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گناہ گار سے گناہ گار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے۔ گناہ گاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

﴿قُلْ يُبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (۳۹/الزمر: ۵۳)

”اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے کہ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔“

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

مسند احمد، ج ۵، ص ۱۷۶؛ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة: ۲۵۶۸۔

﴿فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَاطِنِينَ﴾ (۱۵/ الحجر: ۵۵) ”نا امیدوں میں سے نہ ہو۔“

خلیل اللہ اس رمز سے نا آشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلت، محبت سے مانوق ہے، جواب دیا:

﴿وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾ (۱۵/ الحجر: ۵۶)

”اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔“

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے۔ رحمان و رحیم بھی ہے، رؤف و رفوف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ﴾ (۶/ الانعام: ۵۴)

”اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔“

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ گار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو

کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾

﴿أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا أَوْ جَهَلَ إِلَهًُا لَمْ تَأْتِ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ غُفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(۶/ الانعام: ۵۴)

”اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ، کہ تم پر

سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے، کہ

جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الہی کی طرف رجوع کرے

اور نیک بنے، تو بے شک وہ بخشے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایہ رحمت سے محروم نہیں:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۶)

”اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔“

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے

دستِ خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔“ ❁ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ

❁ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی قوله: ((وهو الذي يبدء الخلق: ۳۱۹۴؛ صحیح مسلم،

کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ: ۶۹۷۱؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۳۔

نے فرمایا: ”کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔“ ﴿یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گناہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں، ﴿کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشا۔“ ﴿یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گناہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکو کاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گناہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شان دار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شہیدِ حقیقی کے سرمایہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔“ ﴿اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گناہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آ کر کہا، یا اللہ! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ رحمۃ اللعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا: ”اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔“ ﴿تم نے دیکھا کہ اسلام نے گناہگاروں کے لیے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

﴿صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ: ۶۹۷۹﴾ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۲  
 ﴿مگر کتب احادیث (صحیح)﴾ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۰۔ ﴿مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۱۴۔﴾  
 ﴿بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللہ الرحمة فی مائة جزء: ۶۰۰۔﴾  
 ﴿بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر: ۶۷۸۰۔﴾

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی نا آشنا تھے۔ کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا، اور اس ذات الہی کے ساتھ اپنی وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھو ٹھیک دو پہر کو عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھران کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لیے ان کو مجبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر زبان پر صرف احدا حد وہی ایک وہی ایک کا ترانہ ہے۔ \* مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوش وحدت سے سرشار ہو کر کہتا تو حید کا با آواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور بڈیوں کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں، دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر وہی سرشاری ہوتی ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ \*

ایک صحابی جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے پر متعین تھے۔ وہ اپنی نیند ٹانے کے لیے خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور محو نماز ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ ”جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیے بغیر چھوڑ دوں۔“ \*

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اس کئی و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی ومیت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لیے خدانے بشارت دی کہ ان کا محبوب خدا اور وہ خود خدا کے محبوب تھے۔ یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا تو فرمایا: ”اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے، کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔“ قبر کھودی جانے لگی۔ فرمایا: ”اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے اس کے ساتھ کشادگی فرمائی۔“ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا: ”ہاں اس کو خدا اور رسول سے پیار تھا۔“ \*

ایک دفعہ آپ نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا وہ جب نماز پڑھا تو تبر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس ﷺ میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا: ”ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔ فرمایا: ”ان کو

\* سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین، ج ۱، ص: ۱۹۵؛ اسد الغابۃ، ج ۱، ص: ۲۰۶، مصر۔

\* طبقات ابن سعد جزء رابع، ص: ۱۶۵؛ تذکرۃ امی ذر غفاری و صحیح بخاری، قصۃ اسلام امی ذر: ۳۸۶۱۔

\* سنن امی داود، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸؛ احمد، ۳/ ۳۴۴؛ صحیح ابن خزیمہ: ۳۶؛

حاکم، ۱/ ۱۵۶۔ \* ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی حفر القبر: ۱۵۵۹۔

بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔“ ﴿﴾ یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ”تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟“ نام ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا بڑا ذخیرہ ہے جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس۔ فرمایا: ”تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ ﴿﴾

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل علیہ السلام بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر لعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔“ ﴿﴾ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کان، بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، در اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“ ﴿﴾ یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدی ﷺ کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔

امام ہزار نے مسند میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں۔ لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے اور اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔“ ﴿﴾ یہ قابل رشک مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کا پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک

﴿﴾ مسلم، کتاب صلوة المسافرين باب فضل قراءة قل هو اللہ احد، ۱۸۹۰: ۱ واقعہ بخاری، کتاب الصلوة، باب النجم بین السورتین فی رکعة: ۷۷۴ میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

﴿﴾ مسلم، کتاب البر والصلوة، باب المرء مع من احب: ۶۷۱۶، بخاری، کتاب الادب، باب ماجاء فی قول الرجل ویلک: ۶۱۶۷۔ ﴿﴾ مسلم، کتاب البر والصلوة، باب اذا احب اللہ عبدا: ۶۷۰۵۔

﴿﴾ بخاری، کتاب الرقاق باب التواضع: ۶۵۰۲۔ ﴿﴾ اس کے ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان پہنچی ہیں بھی ہیں، دیکھو مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الحب فی اللہ، فصل ثانی: ۵۰۱۶؛ شرح السنة: ۳۶۶۴۔

دوسرے کے لیے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔“ ❁

یہ محبت الہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو۔“ ❁ یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلعت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے۔ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں بیچ تھیں۔ دعا فرماتے تھے: ”خدا وندا!

((استل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الی حبك)) ❁

”میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے۔“

((اللہم اجعل حبك احب الی من نفسی واهلی و من الماء البارد)) ❁

”الہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔“

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خشکی سے نہیں سیر ہوتی تھی۔ وہ صرف محبت الہی کا زلال خالص تھا جو اس خشکی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشق الہی (مسح علیہ السلام) کا قول ہے کہ ”انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا“ پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں:

((اللہم ارزقنی حبك وحب من ینفعنی فی حبك)) ❁

”خدا وندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔“

❁ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۱۶۸، ۱۶۹۔

❁ ترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۳۷۸۹۔

❁ ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۴۹۰؛ مستدرک حاکم، ۱/ ۵۲۷۔ ❁ ایضاً۔

❁ ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۴۹۱۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے۔ مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے:

((من كان الله ورسوله احب اليه مما سواهما)) ❁

”یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں بیچ ہو جائیں۔“

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح وہ اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقہ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے اس لیے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبت الہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پہلے پیش کی جا چکی ہے:

﴿فَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (البقرة: ۲۰۰)

”تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔“

لیکن احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑیچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے۔ جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنے بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ”کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے بچہ سے دکتی آگ میں ڈال دے۔“ لوگوں نے عرض کی، ہرگز نہیں۔“ فرمایا:

”تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔“ ❁

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لارہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا: ”ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔“ بولی، تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سٹھا کر فرمایا: ”خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دکھتا ہے۔“ ❁

❁ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من انصف بہن وجد حلاوة الایمان: ۱۶۵، ۱۶۶؛ بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوة الایمان: ۱۶۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد: ۵۹۹۹۔ ❁ ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب ما یرجى من رحمۃ اللہ: ۴۲۹۷۔



آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں، کہ ”یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آ کر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی“ ارشاد ہوا: ”کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے، اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ معوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔“ ❁

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا: ”کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے؟“ انہوں نے کہا، ہاں، فرمایا: ”تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والے ہے۔“ ❁

جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، اور مستور ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لب مبارک ہلتے ہیں تو یہ آواز آتی ہے۔ ”لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔“ ❁ یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا: ”خداوند! بہترین رفیق۔“ ❁

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور در ماندوں کی دستگیری اور اپنے گناہگار بندوں کے ساتھ اس کی شان بخشش کا ترانہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیام ربانی ہم کو سنایا:

”میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن

❁ ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الامرا من المکفرة للذنوب: ۳۰۸۹۔ ❁ ادب المفرد امام بخاری، باب رحمة العیال: ۳۷۷۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النہی عن بناء المساجد علی القبور: ۱۱۸۸۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب آخر ما تکلم به النبی ﷺ: ۴۴۶۳۔

جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو، میں تم کو پہنلاؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پریزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گناہگاروں کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرہ کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکالی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا، تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ اپنے ہی کو ملامت کرے۔“ ❁

محبت کا یہ پُرکِیف نعمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، یہ تسلی و تشفی کا پیام انہیں کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، یہ عنف و کرم کے بحر بیکراں کا ساحل امید انہیں کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گناہگاروں کو ”میرے بندو“ کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ (ﷺ)

❁ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۲؛ ترمذی ابواب الزہد: ۲۴۹۵؛ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۱۶۰ و ۱۷۷؛ ادب المفرد امام بخاری، باب الظلم: ۴۹۰ میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بزہاد دیے ہیں، اس کے بعض بعض کلمے انجیل میں بھی ملتے ہیں، (دیکھو ص ۲۵: ۲۵، ۲۵: ۲۵، ۲۵: ۲۵)۔

(۳۸، ۳۷) مگردنوں کے ملانے سے ناقص و کامل کا فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

## فرشتوں پر ایمان

﴿وَمَلَائِكَتِهِ﴾

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد۔ ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور ”پیام رساں“ کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی توئیں ہیں۔ جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاؤ نہیں کرتے، گویا، ان کی خلقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے، وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انہیں پر اپنے جو احکام اتارتا ہے، یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے، وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابئی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں۔ یونانی، مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام ”عقول عشرہ“ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جن میں سے سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے، جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ”امشاسپند“ ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی ان کو ”وہیم“ کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل و روح القدس وغیرہ سے ان میں سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہر حال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ہیں اور جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صنائع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس

کے حکم سے عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی، وہ کبھی مخلوق بھی کہی جاتی تھیں اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ پر بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی صورت تھی، پارسیوں میں امشا سپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خدا امشا سپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں، ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشا سپند (۶) تھے اور ان کے تحت میں ۳۳ تھے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو مقابل خداؤں کے قائل تھے، اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور بدیوں کو دنیا میں خلق کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء کے حاکم سمجھے جاتے تھے اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پروں کو لے کر باہم نبرد آزارہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشا سپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ فرشتہ بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی ہوتی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہہ کر خطاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ، (تکوین ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے، (تکوین ۶-۲)، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صایوں میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو منظر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقل اول اور عقلی عشرہ تمام عالم کے خالق و کارفرما و مرجع کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے، ان کی پرستش و عبادت قطعاً ناجائز کی گئی، نر مادہ کی مادی جنسیت سے پاک کیے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا شب و روز کام صرف آقا کا حکم بجا

لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں، جن کا کام خدا کی حمد و ثنا، اطاعت و فرمانبرداری ہے اور خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے اس کارخانہ کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لیے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح، ”خداوند“ نہیں مقرر کیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو ”قابل پرستش“ کے لقب سے ملقب کیا، نہ ہندوؤں کی طرح ویو اور ویوتا اور دیوی کہا، بلکہ صرف ”ملک، اور ”رسول“ کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا سجدہ اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق ٹھہرایا گیا، خدا کی جس تسبیح و تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جو ہر طبیعت انہوں نے بیچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾﴾

(۲/ البقرة: ۳۲)

”تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسرا اور متصرف مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق و بندہ اور عاجز و در ماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان وزمین اور پوری مملکت الہی میں اس کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کا فرمانظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً: آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، مادہ پرست گواپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اس آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل ویوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے،

یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھک جاتے ہیں، اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض و سماء کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے، جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الہی کو دنیا کے مخلوق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب و علل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں اور جن کو بت پرست، دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو فرشتے احکام الہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں اور مرضی الہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے، جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب، عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی کارگر ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب و علل کا مسئلہ عقلاً میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمہ آج بھی اسی طرح لائیکل ہے، جس طرح پہلے دن تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکماء طہدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے، تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جاسکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و اسباب کارفرما ہیں، اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں، ان دونوں قسم کے توافقی سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام ”بخت و اتفاق“ رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو ماننے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں، رہ جاتا۔ یہی روحانی علل و اسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظام عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے ”قوائے طبعی“ سے کرتے ہیں اور ہم ان کے ”قوائے روحانی“ سے۔ اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں اور نہ یہ منشا ہے کہ خود اشیاء اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص و طبائع اور مادہ کے اجزائے عنصری کے اندر بالطبع کوئی اصول و دیعت نہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور

اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو انہیں اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔ سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندارِ مستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات، اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمران اور مسلط ہے، بائیں ہمدہ وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابرو باد سے لے کر دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند تک پر ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیاء سے خدا کے اصول مقررہ کے اندر یکساں افعال و حرکات کا صدور کرتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیاء کے مقررہ خواص و طبائع ہی کے سہارے کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے، کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیہنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالمِ کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیہنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پایا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعال اختیاری کی ذمہ داری، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ، ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور افتیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکمِ الہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات و خصائص میں یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

① اب ہم کو تعلیمات نبوی ﷺ یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہیے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو باتوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۙ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

﴿أَيُّدِيهِمْ وَمَا خَلَقَهُمْ ط وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۵-۷۶)

”خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔“

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور و انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَكِةِ رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ مَّقْشَىٰ وَتِلْكَ رُزْمَةٌ يُبَيِّنُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ مَا يَخْتِمْ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

(۳۵/ فاطر: ۱، ۲)

”حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہیر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھادے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لیے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہ غالب و دانا ہے۔“

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ یہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ بھی ہے، یا وہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی مانگنی چاہیے۔

② ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورۃ انفال میں ہے:

﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَفَتَتُوا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۸/ الانفال: ۱۲)

” (یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔“

﴿تَنزِيلُ الْمَلَكَةِ وَالزُّورِ فِيهَا يَأْذِنُ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرِ﴾ (۹۷/ القدر: ۴)

”اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔“  
وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

﴿تَعْرُجُ الْمَلَكَةُ وَالزُّورُ إِلَيْهِ﴾ (۷۰/ المعارج: ۴)



”فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔“

موت کے وقت روح کا قبض کرنا نبی سے متعلق ہے:

﴿قُلْ يَتُوبُ كُمْ مَلَكَ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (السجدة: ۱۱)

”کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ تم پر موت طاری کرے گا۔“

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوَ الْأَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ﴾

(۶/ الانعام: ۹۳)

”اور اگر دیکھو تم جب گناہ گار موت کے سمرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔“

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ يَتُوبُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى الْمَلَائِكَةِ﴾ (۸/ الانفال: ۵۰)

”اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔“

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں، ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر انہیں روحانی علل و اسباب کی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد تدبیر ہے، جو حکم الہی ان ملائکہ کے سپرد ہے، ﴿اسی لیے کبھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، ﴿يُدَبِّرُ الْأُمْرَ﴾ ”وہ کام کی تدبیر کرتا ہے۔“ اور کبھی اس کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے:

﴿وَاللَّعْنَةُ عُرْقَابًا وَاللَّيْثُطِ وَالنَّسِطًا وَالشَّيْطِ سَبْعًا فَالْشَّقِيقِ سَبْقًا فَالْمُدْيَاتِ

أَمْرًا﴾ (۷۹/ النازعات: ۵-۱)

”ذوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے، (اس فضاے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب و علل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی۔“

③ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں:

﴿أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذَانِهِ مَا يَشَاءُ﴾ (۴۲/ الشوری: ۵۱)

”یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے، کہ اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے، تو وہ (اس خدا کی اجازت

صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائكة: ۳۲۰۸ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت فضائے الہی کو تحریر کرتا ہے۔

سے (جو) وہ (خدا) چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔“

دوسری جگہ ہے:

﴿يُنزِلُ الْمَلَكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ (النحل: ۲)

”خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔“  
خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

﴿قَائِلَةٌ نَزَّلَتْهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (البقرة: ۹۷)

”بس اس (جبریل فرشتہ) نے اس قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔“

④ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا﴾ (هود: ۶۹)

”ہمارے سفیر ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر اترے۔“

اسی طرح حضرت زکریا اور مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی:

﴿إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ (مریم: ۱۹)

”میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔“

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے جاتے ہیں۔

﴿قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ﴾ (هود: ۸۱)

”انہوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔“

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد

ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس فعل کو خود اپنی طرف منسوب کرتا

ہے، کہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا:

﴿فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ لَمَنْضُودٍ﴾

(هود: ۸۲)

”جب ہمارا حکم آیا، تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور

اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔“

⑤ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ

رکھتے ہیں:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۖ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۖ لَا يَعْذُبُونَ مَا تَعْمَلُونَ﴾

(الانفطار: ۱۰-۱۲)

”بے شک تم پر نگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔“

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴾ (۱۸/۵۰) (۱۸:۵۰)

”کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔“

﴿ سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۚ لَئِنَّكُمْ عَتِيدَاتٍ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَكَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۗ ﴾ (۱۱۰/۱۰۰)

”تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے، یا وہ رات میں چھپے، یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے، خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔“

﴿ وَيُرْسِلْ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۗ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفْعَلُونَ ۗ ﴾

(۶/الانعام: ۶۱)

”اور وہ خدا تم پر نگران بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔“

وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطے ہیں: ⑥

﴿ لَا يَجْزِيهِمُ الْعَذَابُ الْكَبِيرُ ۗ وَسَتَلْقَاهُمْ الْمَلٰٓئِكَةُ ۗ هٰذَا يَوْمُكُمْ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۗ ﴾

(۲۱/الانبیاء: ۱۰۳)

”نیکو کاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے، کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔“

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَخٰلَفُوْا عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۗ اَلَّا تَخٰفُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ۗ وَاَنْبُرُوْا بِالْحَنٰٓئَةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ ۗ مَحْسٰٓنٌ ۗ اَوَّلِيُوْكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۗ ﴾

(۴۱/فصلت: ۳۰، ۳۱)

”جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔“

﴿ هُوَ الَّذِي يَصَلِّيٰ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ ﴾ (۳۳/الاحزاب: ۴۳)

”وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يَصَلُّوْنَ عَلٰى النَّبِيِّ ۗ ﴾ (۳۳/الاحزاب: ۵۶)

”اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔“

﴿وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ط﴾ (۴۲/ الشوری: ۵)

”اور جو زمین میں ہیں، ان کے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔“

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

﴿أُولَئِكَ جَزَاءُهُمْ أَنْ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝﴾

(۳/ آل عمران: ۸۷)

”ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔“

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝﴾

(۲/ البقرة: ۱۶۱)

”جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔“

② جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

﴿وَيَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

حَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ ۝﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۱)

”اور کفر کرنے والے گروہ درگروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک

کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے

چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔“

﴿وَيَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَىٰ الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

حَزَنَتُهَا سَلِّمُوا عَلَيْهِمْ طِبْعَهُمْ فَادْخُلُوا خِلْدَانًا ۝﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۳)

”اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ درگروہ جنت میں لے جائے جائیں گے،

یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس

کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔“

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۖ سَلِّمُوا عَلَيْهِمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَىٰ الدَّارِ ۝﴾

(۱۳/ الرعد: ۲۳، ۲۴)

”اور جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا

بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔“

﴿عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غُلَاظٌ شِدَادٌ ۝﴾ (۶۱/ التحريم: ۶)

”دوزخ پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔“

﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً﴾ (۸۴/ المدثر: ۳۱)

”ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔“

⑧ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں:

﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَاقِقِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾

(۳۹/ الزمر: ۷۵)

”اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں

مصروف ہوں گے۔“

﴿لَا يَسْتَعِينُونَ إِلَى الْمَلَأِ الْأَعْلَى﴾ (۳۷/ الصافات: ۸)

”اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔“

﴿مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَأِ الْأَعْلَى إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ (۳۸/ ص: ۶۹)

”مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔“

قیامت کے دن بھی یہ تخت الہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے، جو ہر وقت اس کے

ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار رہیں گے:

﴿وَالْمَلِكُ عَلَىٰ أَزْجَائِهِمْ وَسَيُعِلُّ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ﴾

(۶۹/ الحاقة: ۱۷)

”اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ

(فرشتے) اس دن اپنے اپنے اٹھائے ہوں گے۔“

﴿كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾

(۸۹/ الفجر: ۲۱، ۲۲)

”ہرگز نہیں، جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار

در قطار آئیں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْبَلَيْكَةُ صَفًّا﴾ (۷۸/ النبا: ۳۸)

”جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔“

⑨ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں

مصروف رہتے ہیں اور اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور خدا کے حضور میں اہل

زمین کے لیے عموماً اور نیوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں:

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ  
الْرَحِيمُ﴾ (٤٢/ الشوری: ٥)

”اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہر شیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔“

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا

صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے:

﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ  
لِلَّذِينَ آمَنُوا﴾ (٤٠/ المؤمن: ٧)

”جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔“

﴿وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ ۗ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۗ  
يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾ (٢١/ الانبیاء: ١٩، ٢٠)

”آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور مست نہیں پڑتے۔“

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۗ لَا يَسْتَفْتُونَہُ بِالْقَوْلِ ۗ وَهُمْ بِأَمْرِہِ يَعْمَلُونَ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيہِمْ  
وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ ۗ إِلَّا لِمَن ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِہِ مُشْفِقُونَ﴾ (٢١/ الانبیاء: ٢٦، ٢٨)

”بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں..... اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔“

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (٦٦/ التحریم: ٦)

”خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے، وہ اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔“

﴿وَيَسْتَعِزُّ الرَّعْدُ بِحَمْدِہِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِہِ﴾ (١٣/ الرعد: ١٣)

”اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔“

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةِ وَهُمْ لَا يُسْئَلُونَ عَنِ آفَاتِهِمْ رَبُّهُمْ مِنْ قَبْلِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾

(النحل: ۴۹، ۵۰)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔“

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نوافل طوننی فلسفہ کی رو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو معطل ٹھہرا کر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام ساوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم میں فرما نروا جانتے تھے، یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداؤں کا درجہ دے دیتے تھے، جیسا کہ توراہ (صحیفہ تکوین ۱۶، ۱۳، ۱۸، ۲۰، ۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ ”خدا کے بیٹوں“ کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے، (تکوین ۲۰، ۲۶) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے ”چھوٹے خداؤں“ کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہوتی تھی اور ان کی تثلیث کا ایک رکن تھی، عربوں میں وہ خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اسی کے احکام کی بجائے اور ہی میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندہ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں اور نہ خدا کے بلا اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے ان دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ وہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ وہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۗ لَا يَسْتَفِئُونَہٗ بِالْقَوْلِ ۗ وَهُمْ بِأَمْرِہٖ

يَعْمَلُونَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُشْعِفُونَ ۝ إِلَّا لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْفِقَ ۝ وَمَنْ يَنْفِقْ مِنْهُمُ ابْنٌ إِلَهُ مِنْ دُونِهِ فَذَلِكَ نَجْزِيهِمْ جَهَنَّمَ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ ﴿٢١/ الانبياء: ٢٦-٢٩﴾

”مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اور وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے، واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے، لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔“

﴿إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَوَجَّهْنَاهُ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةً ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهُ وَاحِدٌ ۚ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَكَدٌّ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَلَّمْنِي بِاللَّهِ وَكَيْلًا ۚ لَنْ يَسْتَكْبِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَنْ يَسْتَكْبِفْ عَنْ عِبَادَتِي وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ۝ ﴿٤/ النساء: ١٧١، ١٧٢﴾

”خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کافی وکیل ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔“

﴿وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۚ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ ﴿٣/ آل عمران: ٨٠﴾

”خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ، کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔“

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهْلُوا لِي أَمْ لَكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيِّنَا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ۝ ﴿٣٤/ سبا: ٤٠، ٤١﴾

(٣٤/ سبا: ٤٠، ٤١)

”اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے



تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، اکثر انہیں جنوں پر ایمان لائے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا أَلَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

(۷۸/ النبا: ۳۸)

”جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ نہ بول سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔“

﴿وَكَمْ مِنْ مَلَائِكَةٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي عَنْهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُرِضِي﴾ (۵۳/ النجم: ۲۶)

”اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو اجازت دے اور پسند کرے۔“

﴿أَفَأَصْفَكُمْ رِبُّكُمْ بِالْبَيْنِ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا﴾ وَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَآبْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ﴿سُبْحٰنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ عَلَوْا كِبِيرًا ﴿سُبْحٰنَهُ لَهٗ السَّمٰوٰتِ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۴۰-۴۴)

”کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کی باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہہ دو اے پیغمبر! کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے، تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔“

﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴿۱۷﴾ اَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ ط سَتَلْبَسُ شَهَادَتَهُمْ وَكُسُوفًا ﴿۱۸﴾ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ط مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۱۹﴾﴾ (۴۳/ الزخرف: ۱۹، ۲۰)

”اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے انہیں اس کا تحقیقی علم نہیں، وہ

صرف انکل لگاتے ہیں۔“

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصا مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ تورات میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا“ (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر:

﴿فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ لَئِمَّةً وَمِنْهُمْ خِيفَةٌ ۖ قَالَ أَوْلَا لَا تَخَفُ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۗ﴾ (۱۱/ ہود: ۷۰)

”جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے، تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ڈر نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لیے) بھیجے گئے ہیں۔“

کفار قریش کا مطالبہ تھا، کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب میں کہا گیا:

﴿وَكُوَّعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَكَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلِيسُونَ ۗ﴾ (۶/ الانعام: ۹)

”اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لیے) اس کو آدمی ہی بناتے، تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے، (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں بلکہ آدمی ہو)“

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کے قصوں میں ہے:

﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۗ﴾ (۱۷/ مریم: ۱۷)

”وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔“

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

- ① ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔
- ② دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا اہل یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے اور حقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات مؤثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو مؤثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرت الہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

## رسولوں پر ایمان

### ﴿وَرَسُولِهِ﴾

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی، اسی کی سر زمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور ہماری زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بائبل و نیوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کو بجائے خود تمہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا۔ آپ ﷺ نے یہ سکھایا کہ ”دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے۔“ ﴿ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”گوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا۔“ ﴿اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکو کاری سے ہے۔ ﴿اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہو گئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساوات انسانی کا راستہ صاف ہو گیا، بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کتبہ ہونے پر ناز تھا۔ وحی محمدی ﷺ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلَهُنَّ خَلَقْتُ﴾ (۵/ المائدة: ۱۸)

”بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔“

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف، عدل و کرم اور اس کی رحمت عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (۶۲/ الجمعة: ۴)

﴿مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۴۱۱۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب: ۳۹۵۔﴾

﴿قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُمْ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۳)﴾

”یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔“  
 ﴿قُلْ إِنْ أَنْهَدِي هُدَى اللَّهِ أَنْ يُؤْتَى أَحَدٌ مِمَّا أُوْتِيْتُمْ أَوْ يُحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ  
 إِنْ الْفَضْلُ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ  
 وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٣﴾ آل عمران: ٧٣، ٧٤

”کہہ دو کہ ہدایت، اللہ کی ہے (اسرائیلی علما اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھک سکیں کہہ دو کہ یہ (نبوت کا فضل) اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔“

﴿مَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِمَّا رَزَقَكُمْ وَاللَّهُ بِرَحْمَتِهِ مِنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

(٢/ البقرة: ١٠٥)

”اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر بن کر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔ بعثت محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے نا آشنا تھی۔ ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پریشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور راہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادان ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوہ نورانی سے محروم یقین کیا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندانہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندگی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب و عجم اور شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ﴾ (١٠ / یونس: ٤٧)

”اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔“

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا﴾ (١٦ / النحل: ٣٦)

”اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔“

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ﴾ (٣٠ / الروم: ٤٧)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔“

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (١٣ / الرعد: ٧)

”اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما آیا۔“

﴿وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (٣٥ / فاطر: ٤٤)

”کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیا رکرنے والا نہ آیا ہو۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُبَلِّغَ قَوْمَهُ لَيْسِينَ لَهُمْ﴾ (١٤ / ابراہیم: ٤)

”اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا،

تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔“

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الہی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔ ایک یہود کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو بلجھ، شودر اور چندال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو سحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ((وَالنَّبِيِّنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ)) ﴿سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے۔“ غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی یا عیسوی اور سلیمانی داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور راہنمائی سے سرفراز کیا ہے، ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا:

﴿إِنَّ الدِّينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ

بَعْضٌ وَنَكَفَرُ بِبَعْضٍ ۗ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَكَمَرُ بَعْضُهُمْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمُ اللَّهُ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۙ﴾

(۴/ النساء: ۱۵۰-۱۵۲)

”بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ پکڑیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ابانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔“

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَالْكَتٰبُ وَالنَّبِيّٰنَ ۙ﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۷)

”اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔“

﴿وَمَنْ يُفْكَرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ سَلٰٓلًا بَعِيْدًا ۙ﴾

(۴/ النساء: ۱۳۶)

”اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔“

سورہ بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ ۖ لَآ تَفْتَرُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ۖ﴾

(۲/ البقرة: ۲۸۵)

”ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔“

﴿لَآ تَفْتَرُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ۖ﴾ (۲/ البقرة: ۲۸۵)

”ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔“

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول، صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ تنگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محرومی قبول کی، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محرومی قبول نہ فرمائی ❀ اور ان سے صاف کہا:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَتَّقُونَ مِمَّا آتَاكُمْ مِنَ اللَّهِ وَمَا آتَاكُمْ مِنَ الْوَحْيِ وَمَا آتَاكُمْ مِنَ الْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ﴾

وَأَنْ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ ﴿۵۹﴾ (المائدة: ۵۹)

”اے یہود! کیا بیروہ تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر، اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔“  
خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چسکتے تھے، مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، تقدس اور معصومیت سے انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُونَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوا يَا هَيْتَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿۵۸﴾ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴿۵۹﴾﴾

(الزخرف: ۵۷-۵۹)

”اور جب مریم کے بیٹے کی کہادت بیان کی گئی تب ہی تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو تجھ پر دھرتے ہیں صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔“

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ ابن مریم کو بندہ اور رسول ماننا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرست تصور کر کے الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں، طہرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے، ایک دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ



صرف انہیں انبیاء ﷺ کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے مگر یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً: حضرت ہود اور حضرت شعیب ﷺ بعض ایسے ہیں جن کو وہ جانتے تھے لیکن ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے، مثلاً: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ﷺ۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے۔ اسلام سے پہلے نبوت و رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص، واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کرنے کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق یقین رکھتے تھے کہ اس کی دایا بد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے ﴿ اسی لیے حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف ﷺ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے ﴿ حضرت داؤد اور سلیمان ﷺ کی حیثیت بھی ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت نحیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں اسی طرح عیسائیوں میں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ”مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے۔“ ﴿ موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ ﷺ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے فرائض بتائے اور اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانا نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے ہیں کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں وہ ہادی (راہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشر (خوش خبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نود (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے تھے اور خدا ان کے لیے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں

﴿ دیکھو تورات صحیفہ تکوین، باب: ۲۰-۷۰ ﴾ ﴿ نمر تکوین: ۱۴-۱۸ ﴾ ﴿ انجیل۔

جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا خلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی طرف شان نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں منسوب ہیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لیے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گناہ گاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کہ جو خود گناہ گار ہے وہ گناہ گاروں کی راہنمائی کا مستحق نہیں کہ اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا اس بنا پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو رباطوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوا یا:

﴿وَوَدَّأَبَاؤُنَا أَنْ نَبْعُدَ آبَاءَنَا مَا بَدَعُوا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ﴾ (مريم: ۲۲)

”اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بد بخت نہیں بنایا۔“

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بد بختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر تھوپا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہ کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوا یا:

﴿وَمَرْيَمُ ابْنَتْ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَيْنَتْ فَرْجَهَا فَنفَعْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَوَدَّعَتْ بِكَلِمَاتٍ

رَبِّهَا وَكَلَّمَهَا وَكَانَتْ مِنَ الْقَنِينِ﴾ (التحریم: ۱۲)

”اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور

اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔“

یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ

توراة میں شرک قرار دیا جا چکا تھا اور قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ كَفَرُوۡا يَعْلَمُوۡنَ النَّاسِ السَّحَرٰتِ ﴾

(۲/ البقرة: ۱۰۲)

”اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سکھاتے تھے۔“  
اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت پیدا نہیں ہو سکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچی اور بہت سی غیر تو میں اور دوسرے انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام و نشان صحیفہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتادی گئی، فرمایا:

﴿ اِنَّا اَوْحٰیۡنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحٰیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّالۡسَّیِّدِۡنَ مِنْۢ مِّنۢۢ بَعۡدِہٖؕ وَاَوْحٰیۡنَاۤ اِلٰی اِبۡرٰہِیۡمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَّیَعۡقُوۡبَ وَّالۡاِسۡطٰطِ وَّعِیۡسٰی وَاٰیُوۡبَ وَّیُوۡنُسَ وَّہٰرُوۡنَ وَّسُلَیۡمَؕ وَاَنۡۡۡۡنَاۤ دَاوۡدَ زَبُوۡرًا وَّرُسُلًا قَدْ قَصَصۡنَاۡہُمْ عَلَیۡكَ مِنْ قَبۡلِ وَّرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡہُمۡ عَلَیۡكَ ؕ وَاٰیٰتِ اللّٰہِ مُؤۡسِیٰ تَكۡلِیۡمًا ؕ رُسُلًا مَّشٰہِیۡرِیۡنَ وَّمُنۡذِرِیۡنَ لَیۡسَ لَآیۡكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلٰی اللّٰہِ حُجَّةٌۢۢۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَزِیۡزٌۢۢۢ حٰكِیۡمًا ؕ ﴾

(۴/ النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

”ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پاس وحی بھیجی، جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے پیغمبروں کو بھیجی، ہم نے ابراہیم کو اور اسماعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب کو اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو، وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا، جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا، تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب اور دانا ہے۔“

انبیا کے متعلق یہی حقیقت سورہ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

﴿ وَاَقۡرَبُۡۤ اُرۡسُلٰنَاۤ رُسُلًاۢۢۢ مِّنۢۢ قَلِیۡلِكَ مِّنۢۢہُمۡ مَّنۢۢ قَصَصۡنَاۤ عَلَیۡكَ وَاَمۡنٰہُمۡ مِّنۢۢ لَّمۡ نَقۡصُصۡ

عَلَیۡكَ ؕ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷۸)

”اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔“

تعلیم محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بنا پر بعض علما نے ہندوستان کے کرشن اور رام کو بلکہ ایران کے زردشت کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو بھی پیغمبر کہا ہے، بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیا ﷺ کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن یہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔ اس قسم کے انبیا ﷺ جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الصَّاغُوتَ ۗ﴾

(النحل: ۶۶)

”اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا ۖ فَاعْبُدُونِ ۗ﴾

(الانبیاء: ۲۱)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھ کو پوجو۔“

اس لیے وہ تمام قدیم رہبران انسانی اور راہنمایان عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی

کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناں بریلوی۔ مکتوب چہارم ص: ۳۷۲-۳۷۳۔

ملل و نحل لابن حزم، الکلام علی انبیہود، ج: ۱، ص: ۱۱۳۔

تبلیغ اور تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بنا پر انبیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیا ﷺ میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ ۚ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۗ

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ بُرُوحَ الْقُدُسِ ۗ ﴾ (بقرہ: ۲۵۳)

”ان رسولوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔“

آپ نے دوسرے انبیا ﷺ کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریہ اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا: ”وہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے۔“ \* ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کون تھا، فرمایا: ”یوسف علیہ السلام پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ۔“ \* ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر فضیلت دی ایک مسلمان کھڑے یہ سن رہے تھے ان کو غصہ آیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، اس نے دربار نبوی میں جا کر شکایت کی آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سنی اور نہایت برہم ہو کر فرمایا: ”پیغمبروں میں باہم ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔“ \* یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدت مذہب، روحانی مساوات اور انسانی اخوت اور تمام انبیا ﷺ اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھوں سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان کی عظمت، جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس

\* مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۷۸، ۱۸۴۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل: ﴿لقد كان في يوسف واخوته...﴾۔ ۳۳۹۰۔

\* صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وان يونس لمن المرسلين﴾: ۳۴۱۴۔

تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس کو مٹایا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے راہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت اور رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی سیرتوں سے نا آشنا تھے، جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے اور جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے اور محمد رسول اللہ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تمہر کا ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے اور آج تمام مسلمانوں میں وہ نام شائع اور ذائع ہیں، ان کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی اور ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود و سلام پڑھے۔

قرآن پاک سورة زخرف، آیت نمبر: ۵۷۔

صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ﴿ان یونس لمن المرسلین﴾: ۳۴۱۴۔

## کتاب الہی پر ایمان ﴿وَكُتِبَ﴾

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفہٴ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات کو اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے۔ تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی ہے، تاکہ یہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفہٴ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ سورہ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ﴾ (٢/ البقرة: ٤)

”اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔“

کتاب الہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صدقاتوں اور عملوں کو بدل و جان قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں، اس لیے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام کی باتیں ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی کہ:

﴿بِمَا جِئْتُ بِهِ﴾ ”جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ۔“ قرآن نے کہا:

﴿وَأْمِنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَيَّ﴾ (٤٧/ محمد: ٢)

”اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔“

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیروں کو میرے پیروں پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہل قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانوں کی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفہٴ محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورہ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (٢/ البقرة: ٤)

”اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ پر اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا۔“

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ ﴾

(۲/ البقرة: ۲۸۵)

”رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہل ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔“

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام کا اجمالی ذکر کرنے کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ اِلٰى اٰبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيٰعْقُوْبَ  
وَالاِسْبٰطِ وَمَا اَوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ ﴾

(۲/ البقرة: ۱۳۶)

”(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ان سب پر ایمان لائے۔“

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے:

﴿ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلٰى اٰبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيٰعْقُوْبَ  
وَالاِسْبٰطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ ﴾

(۳/ آل عمران: ۸۴)

”کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔“

سورہ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر قرار دیا گیا:

﴿ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِۦ وَالَّذِيْنَ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهِۦ وَالَّذِيْنَ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَرَسُوْلِهِۦ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ  
صَلٰٰلًا بَعِيْدًا ۝۱۱ ﴾ (۴/ النساء: ۱۳۶)

”اے وہ لوگو! جو ایمان لاکھے ہو ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں



کا اور اس کی کتابوں کا..... انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔“

سورہ مؤمن میں ان منکروں، کوعذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں:

﴿الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ إِذِ الْأَعْلَالُ فِي

أَعْتَابِهِمْ وَالسَّلِيلُ يُسْحَمُونَ ﴿٤٠﴾ (المؤمن: ٧٠، ٧١)

”جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر، ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، ان کو جھٹلایا وہ عنقریب

جانیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھینچے جائیں گے۔“

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تو راتہ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ

بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

﴿إِنَّ هَذَا لَبِئْسَ الْأَوَّلِيُّ﴾ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴿١٨﴾

(١٨/ الاعلیٰ: ١٨، ١٩)

”یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔“

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

﴿أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةٌ مَّا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ﴾ (٢٠/ طہ: ١٣٣)

”کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟“

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزِيلُنَّ أُولَٰئِكَ﴾ (٢٦/ الشعراء: ١٩٦)

”اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔“

اس بنا پر انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیلی اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے، جن

کتابوں کے نام مذکور ہیں ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالا جمال ایمان ضروری ہے۔

کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن

میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاعت سے بچنے کی نصیحت ہے تو اگرچہ ہم اس کو بصریح خدا کی

کتاب قبول نہیں کر سکتے، تاہم بالصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ”اہل

کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔“ ❁ یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ یہود تو راتہ کے سوا کچھ نہیں

مانتے، عیسائی تو راتہ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں مگر انجیل سے پہلے کی

دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں

❁ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب يجوز من تفسير التوراة: ٧٥٤٢ و کتاب التفسیر: ٤٤٨٥۔

کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، توراہ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری پیشتر آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے، جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہود اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی توراہ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو مدخل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور ”غیر قومیں“ یا مخزون اور غیر مخزون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی اور یہود اور بت پرستی گو تین قومیں مانیں جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں، اس لیے وہ اکثر امور میں رومن لا کے ماتحت رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں رومی اور غیر رومی اور ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت اور پچھتو قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے اور اسلام کی تیرہ صدیوں میں ان پر برابر عمل ہوتا رہا یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:

### ① مسلمان

جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں وہ ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ

کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح کیے ہوئے جانور کھا سکتے ہیں اور اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

### ② اہل کتاب

یعنی ان کتابوں کے پیروجن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے دور میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ ہیں گے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

### ③ شبہ اہل کتاب

یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراہ اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کیے اور وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں اور ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

### ④ کفار اور مشرکین

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جاسکتا ہے، لیکن حقوق کے حصول کے لیے ان کو کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں خرائی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے

لیے آمادہ کیا اور مجوسیوں اور صابیوں اور یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کی۔

### وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد تک باری باری سے پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفہ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعہ، منک اور منہاج۔ شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منک کے معنی طریق عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الہی، ہمیشہ ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا، نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قدیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیا آتے رہے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید، اس کے صفات کاملہ انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اور اخلاقِ فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرع منہاج اور منک کہا ہے اور وہ جزئیات احکام اور متفقہ حصول مقصد کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں، مثلاً: عبادت الہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے اسی طرح اعمالِ فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا مستفقہ نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جواز کی سچائی اور ابدی صداقت ہے ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی وابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اپنے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔ انبیاء علیہم السلام کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب اس کا صحیفہ وحی جو اس کے دین و شریعت کا محافظ ہوتا ہے کھو گیا ہے یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، صحیفہ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراہ کے سفر تکوین میں ہے صحیفہ موسیٰ نازل ہوا۔ صحیفہ موسیٰ کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا اور چونکہ وہ دنیا کے آخر تک کے لیے آیا اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے ائمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راہنما پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی ﷺ کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی ﷺ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

”وحدت دین“ کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وُضِيَ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَهُهُ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۗ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِّى بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۗ فَاذْكُرُوا أَنْتُمْ نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ رِجَالًا وَكُنْتُمْ فِي بَيْنِ يَدَيْهِ أَعْبَادًا ۗ لَنَا اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۗ لَنَا اللَّهُ أَعْمَالُنَا وَلكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۗ لَا حِجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۗ وَاللَّهُ الْمَوْجِدُ ۗ﴾ (٤٢/ الشورى: ١٣، ١٥)

”اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو اس نے نوح سے کبھی تھی اور جو ہم نے حکم بھیجا تم کو اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ کو اور عیسیٰ سے یہ کہ ”دین“ کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس

کو چاہتا ہے جنہیں لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے انہوں نے وحی کے علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امر حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو یقین نہیں لینے دیتا سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، ہم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کام کا، ہم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔“

ان آیات مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ داری کی راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہیں پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ! تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعوتی پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اسے اہل کتاب! جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں ان کے ساتھ عدل و انصاف کروں پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دونوں نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس لفظ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جواب دہ نہیں اور تمہارے کام کے ہم نہیں، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا آرِبًا لِّبَعْضٍ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَتَقُولُوا الشَّهْدُ وَإِيَّاكُمْ مَسْلُومُونَ ﴿٦٤﴾﴾

”اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے۔ متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الہی کے تابع (مسلم) ہیں۔“

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں، ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَزَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شَيْعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يَنْبِئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۹)

”بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے، تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں، ان کا کام اللہ کے حوالے ہے، وہی ان کو بتا دے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔“

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ”دینِ قیم“ جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اس کی دعوت دی گئی:

﴿قُلْ إِنِّي هَدَىٰ رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قَدِيمًا ؕ إِنَّ إِلَهَنَا إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (۶/ الانعام: ۱۶۱)

”کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جو دینِ صحیح ہے، ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

غرض اسلام وہ ”دینِ قیم“ ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے، جس کی طرف انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے، اسی لیے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ فَيَهْدِيهِمْ أَفْتَدَهُ﴾ (۶/ الانعام: ۹۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہیں کی راہ پر چل۔“

بعض اسلامی حدود و شرائع کے بعد فرمایا گیا:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الَّذِي كَفَرْتُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۴/ النساء: ۲۶)

”خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔“

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا

ہے اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے یہ کہا گیا:

﴿ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۖ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ۗ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ: ۱۸، ۱۹)

”بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی، یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔“

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۗ ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۱۹۶)

”اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔“

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

﴿ مَا يَقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۗ ﴾ (۴۱/ خم السجدة: ۴۳)

”(اے محمد ﷺ) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔“

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ اسی پرانی دعوت کی یہ تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یاد بگئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرع، منہاج اور نسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے حضرت داؤد کی اولاد دینی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیم



عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ ان کا قبلہ بنی۔ چنانچہ قرآن نے تعین قبلہ کے موقع پر کہا:

﴿وَاللَّيْلُ وَجِهَةٌ هُوَ مَوْلَاهُمَا فَاسْتَقِيمُوا الصِّرَاطَ﴾ (البقرة: ۱۴۸)

”اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔“  
یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو اس لیے فرمایا:  
﴿كَيْسَ الْيَتِيمِ أَنْ تَوَلَّوْنَا وَجْهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْيَتِيمَ مَنْ بِاللَّهِ﴾

(البقرة: ۱۷۷)

”نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)۔“

اسی طرح خانہ کعبہ کالج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا، ہر مذہب نے اپنے لیے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے، اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لیے متعین کیا:

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُبَارِعُكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ ۗ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَإِنْ جَدَلُوكَ فَقُلْ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝﴾

(الحج: ۶۷، ۶۸)

”ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہباً پابندی کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑانہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو بے شک سو جہ کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔“

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پہلے یہودیوں سے کہا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَجْمَعُ بِهَا التَّيْمُونُ الَّذِينَ آسَلُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّالِيَيْنُونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ﴾

(المائدة: ۴۴)

”ہم نے تورات اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ

کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ گمبہاں تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔“  
پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿وَقَفَيْنَا عَلَىٰ أَنَاكِهِمْ بَعِيسَىٰ ابْنَ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ ۖ وَإِنِّي لَهُ  
الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۗ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَمُوعِظَةً  
لِّلْمُتَّقِينَ ۗ وَلِيَحْكُمَ أَهْلَ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۗ﴾ (٥ / المائدة: ٤٦، ٤٧)

”اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہا کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اس کو جو اس کے  
پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے  
سے پہلے کی یعنی تورات کی اور ہدایت اور نصیحت پر ہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ انجیل  
والے اس کا حکم دیں جو اس میں اترا۔“

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ قَوْلًا مِّن  
بَيْنَهُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَبَثًا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۗ﴾

(٥ / المائدة: ٤٨)

”اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی  
ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر، جو خدا  
نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔“

دیکھو کہ کس خوبی کے ساتھ صحیفہ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہل  
مذہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن  
تمام گزشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یک جا ہیں لیکن ان لوگوں  
نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہوا کیا ہیں؟ کتاب الہی میں  
تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش:

﴿قَوْلِيلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكُتُبَ يَأْتِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

(٢ / البقرة: ٧٩)

”افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف  
سے ہے۔“

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی شریعت الہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کر،

اس کے بعد حدود اور جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا فرمایا:

﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَا ط﴾ (۵/ المائدة: ۴۸)

”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔“

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَى شَيْءٍ ۚ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ ۚ

وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكُتُبَ ط﴾ (۲/ البقرة: ۱۱۳)

”اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا: یہود کچھ حق پر نہیں، حالانکہ وہ

دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔“

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَكُوا ط﴾ (۲/ البقرة: ۱۳۵)

”اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔“

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ:

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۗ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا

وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ ۗ وَمَا أَوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ

وَمَا أَوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نَفْتَرُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۗ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۗ فَإِنِ آمَنُوا

بِيشِئٍ مَّا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۗ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۗ﴾

(۲/ البقرة: ۱۳۵-۱۳۷)

”کہہ بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو، جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو

کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اس کی اولاد پر اتارا

گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا،

سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر

یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر

روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔“

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ط﴾ (۲/ البقرة: ۱۱۱)

”یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔“

جواب دیا گیا:

﴿ تِلْكَ أَمَانِيُّكُمْ ۗ ﴾ (٢/ البقرة: ١١١) ”یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔“  
 ﴿ بَلَىٰ ذَٰلِكُمْ أَكْبَرُ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلِئِنَّ أَجْرَهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ ﴾ (٢/ البقرة: ١١٢)

”ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکو کار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔“

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
 وَكَمَلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ ﴾

(٢/ البقرة: ٦٢)

”بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر و بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روز آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے، جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے، اس لیے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُتَّخَذُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُوا نُؤْمِنُ  
 بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ ۗ وَنُرِيدُونَ أَنْ يُتَّخَذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ  
 حَقًّا ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَكَمَرُوا بَيْنَ اللَّهِ  
 وَرُسُلِهِ ۖ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمُ اللَّهُ جُورَهُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۗ ﴾

(٤/ النساء: ١٥٠-١٥٢)

”بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں

کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدادے گا اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

دوسری آیت میں ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (النور: ۶۲)

”مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔“

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان مشروط ہے اور دوسرے یہ کہ ایمان عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُتْلَىٰ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِن رَّبِّكُمْ وَلَا يَرْبِدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالشَّيْطُونَ وَالصَّارِي مَنِ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَحَمَلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

(۵/ المائدہ: ۶۷-۶۹)

”کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراہ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر ﷺ) جو تیری طرف اُترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا، تو ان منکروں کا غم نہ کرو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ تو حید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَارْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رَسُولًا قُلْنَا جَاءَ هُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَارْتَابُوا وَفَرَّقَانَا فِتْنَةً ۖ وَحَسَبُوا أَنَّهُ لَأَنكُورٌ ۖ فَنَنفَخُوا صَوْلًا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَبَّوْا كَثِيرًا مِّنْهُمْ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌ ۖ بِمَا يَعْمَلُونَ ۖ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ

اللَّهُ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَبْنِي إِسْرَائِيلَ عَبْدُ اللَّهِ وَرَبُّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَكَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۚ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثُ ثَلَاثٍ وَمَنْ مِنَ الْإِلَهِ إِلَّا إِلَهٌ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَدْرِكُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٥﴾ (المائدة: ٧٠-٧٣)

”بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتوں کو جھٹایا اور کتوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا اور ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، بے شہدہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہی اللہ ہے مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جو اللہ کو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گناہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں بے شہدہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی اللہ نہیں، مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔“

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے ”حسن عمل“ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

﴿وَكُونُوا يَوْمَئِذٍ بِاللَّهِ وَأَلَّيْتُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوا آلِهَةً وَّالِيَاءَ وَلَكِن كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿٥﴾﴾ (المائدة: ٨١)

”اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ ایمان لے آتے، تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔“

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترکہ دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست با تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

﴿أَفَتَدْعُونَ إِلَهُكُمْ إِذْ كَانَ اللَّهُ بَيْنَ يَدَيْهِمْ فَهُمْ يَنْهَوْنَ أَعْيُنَهُمْ فَذُكِرُوا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَأُولَئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأُولَئِكَ هُمُ السَّاجِدُونَ لِلْإِنْسَانِ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ الَّذِي بَدَأَهُمْ وَالَّذِي يَرْجِعُهُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٥﴾ قُلْ أَمَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ

مِنْهُمْ وَسَخَّنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۸۳﴾ وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۸۴﴾ (۳/ آل عمران: ۸۳-۸۵)

”کیا وہ دین الہی کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوش سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائیں جائیں گے (اے پیغمبر!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم اور اسمعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اتر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ مشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ

الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعٌ الْحِسَابِ ۗ فَإِنْ حَاجَّوْكَ فَقُلْ

أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعْتُ ۗ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹، ۲۰)

”بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ، جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر اے پیغمبر! یہ تجھ سے پھر کج بھجی کریں، تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔“

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اس اسلام کو قبول

کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأَقْبَانِ ۖ أَسْلِمْتُمْ ۗ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۗ وَإِنْ تَوَلَّوْا

فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ عَلَىٰ الْبِلْغَةِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۗ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۰)

”اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے

اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔“

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ”ہدایت نامہ“ ہے کہ وہ دین اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ”توحید کامل“ ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا، مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ یہ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو، اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخری دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف و تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی ﷺ کی دعوت جہاں وی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گزری یہ ہے:

﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأَهْلِيْنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ؕ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۗ﴾

(۲۰/۳ آل عمران)

”اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے، تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔“

سورہ بقرہ میں ہے:

﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ؕ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ؕ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ أَمَّنُوا بِيْئْسَ مَا أَمَّنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۗ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا



﴿هُم فِي شِقَاقٍ﴾ (٢/ البقرة: ١٣٦، ١٣٧)

”(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترا اور جو ابراہیم اور اسمعیل پر اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانتے جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد میں ہیں۔“

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدی ﷺ کی طرف دعوت انہی ”ہدایت“ کے پانے کے لیے ہے جو اسلام یعنی انبیاء کے دین ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح و نجاتِ کامل اب اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَالْآخِرَةَ هُمْ يُوقِنُونَ ۗ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ (٢/ البقرة: ٤، ٥)

”جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر!) اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور سچھی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدی ﷺ کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں:

﴿وَرَسْمِيَّ وَبِعْتِ كُلَّ شَيْءٍ ۖ فَسَأَلْتَهَا لِلَّذِينَ يُتَّقُونَ ۖ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۗ الَّذِينَ يُتَّقُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأَخِيَّ الَّذِي بَدَّوْنَهُ مَلَكُوتًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ ۖ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۗ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَأَبْغَعُوا التَّوْرَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۗ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأَخِي الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ ۗ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝﴾ (٧/ الاعراف: ١٥٦-١٥٨)

”اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا

ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری وہی کامیاب ہیں کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔“

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحیفِ الہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی تختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں اور نیز آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے، اس لیے ہدایت نامہ نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحی محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دینِ محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفہ محمدی ﷺ لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دینِ کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحیفِ الہی پر مبین اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مبین ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختم نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں:

تکمیلِ دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دینِ الہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و مناج و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔“ (استثنا ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں

اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے لئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا:

”لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں

سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلانے گا۔“ (یوحنا ۱۴-۲۶)

”اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ اس لیے کہ

وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں

کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ

کہے گی لیکن جو کچھ وہ نہ گئے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔“ (یوحنا ۱۶-۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز نا تمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس

کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم صلی اللہ علیہ وسلم آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی

اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی روح

ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آیا

ہوں، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الہی نے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾

(۵/ المائدہ: ۳)

”آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین

پسند کیا۔“

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد

تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے ﴿یا انسانوں کے اضانے اور تصرفات تھے۔ بدل کر ایسے

مناسب اور آسان احکام نازل کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد

میں آنے والے پیغمبر کی پیش گوئی نہیں کی، نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل

کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿وَمَا أُنزِلَ مِنْ

قَبْلِكَ﴾ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن ﴿وَمَا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِكَ

﴿كُلُّ الطَّعَامِ حَلَالٌ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ﴾ (الایة ۳/ آل عمران: ۹۳)

قبول کرنے کا ہمیں شائبہ بھی نہیں۔  
قرآن مجہمیں کتب ہے

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے:

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (المائدة: ۴۸)

”اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔“

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے، اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں۔ فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ﴾

(المائدة: ۴۸)

”اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی

کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔“

لفظ ”مجہمیں“ کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: شاہد اور امین، قرآن اپنے سے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قنادہ رضی اللہ عنہ: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں، قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفہ الہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الہی

دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا

کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تو رات جمل جمل کر

خاک ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے، تحریر ہوئی پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں

تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت مشتبہ کر دی۔ زردشت کا

صحیفہ سکندر کی نذر ہوا اور اب صرف گا تھا کا ایک حصہ بچا، کھچا رہ گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ایسا ہوا

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری مذہب بنا کر نہیں بھیجا تھا اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن

قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ

تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور پھر کس وثوق سے فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

”ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔“

یہ وعدہ الہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

﴿ اِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنَهُ فَاِذَا قُرِئَتْ فَانْتَعِمُوا قُرْآنَهُ ثُمَّ اِنَّا عَلَيْنَا بَيَانُهُ ۗ ﴾

(۷۵/ القیامۃ: ۱۶-۱۹)

”بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم

پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔“

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ

نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ ایک تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ

پاسکے گی، فرمایا:

﴿ وَاِنَّهُ لَكَتٰبٌ عَزِیْزٌ ۙ لَا یَاْتِیْهِ الْبٰطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَاَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۙ تُنزِلُ مِنْ حٰكِمٍ مَّوَدِّعٍ ۙ ﴾

(۴۱/ ختم السجدة: ۴۱، ۴۲)

”اور بے شک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور

نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے

اترا۔“

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل

نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی

کی جہت سے کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لیے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب

رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے

پاک رہے گی۔ یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

حتم نبوت

مقامات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور

اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی ﷺ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ

تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ وہ

کامل اور صحیفہ الہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخ انسانی

گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں۔ زمین کے کونے

ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور

صادق ماننے کا دلولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صدائقوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دین ازلی ہوگا جس کا نام ”اسلام“ ہے اور نوحی اور ابراہیمی اور موسوی، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لیے فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكِتَابَ الَّذِي نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّن قَبْلِ أَنْ نُنظِمَ  
وَجُوهَهَا فِتْرَةًهَا عَلَىٰ آذَانِهَا أَوْ نُلْعَثُوهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ط﴾ (٤ / النساء: ٤٧)

”اے وہ لوگو! جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گناہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری، قرآن (جو) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں، تصدیق کرتی ہے۔“

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لیے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

﴿وَأَمِنُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أُولَٰئِكَ كَافِرِينَ ط﴾

(٢ / البقرة: ٤١)

”اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے، اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو۔“

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿وَأَذِيقِلْ لَهُمُ آمِنُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ اللَّهُ قَالُوا نُوهِنُ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا وَيُكْفَرُونَ بِمَا وَرَّأَيْنَاهُ وَهُوَ  
الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ط﴾ (٢ / البقرة: ٩١)

”اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ، تو جواب دیا کہ جو ہم پر اتارا ہم اس کو مانتے ہیں اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے

پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔“

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے صرف یہی نہیں فرمایا کہ وہ تنہا آپ کی نبوت پر ایمان لائے، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے، سورہ سبأ میں ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (سبأ: ۳۱)

”اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب (یعنی تورات) پر۔“

اور اسی لیے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ ”جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔“ الغرض وہ ازلی وابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے، یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوَا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۖ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۚ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۵۱-۵۳)

”اے پیغمبرو! سٹھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔“

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی:

((الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَالَمَاتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّىٰ وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ)) \*

”تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں، جن کا باپ ایک ہے اور امائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔“

\* صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا..... ۳۴۳۵۔

\* صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ..... ۳۴۴۳۔

## پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٢/ البقرة: ١٧٧) ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾

(٢/ البقرة: ٤)

اسلام کے سلسلہ ایمانیت کی آخری کڑی ❁ ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیت کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (٢/ البقرة: ٤) ”اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“

﴿مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٩/ التوبة: ١٨)

”جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔“

﴿الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (٩/ التوبة: ٤٥) (٢/ البقرة: ١٧٧)

”جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔“

”آخرہ“ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظ صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً: ”دنیا“ کے لفظی معنی ”قریب ترین“ کے ہیں اور یہ صفت ہے، اسکا موصوف الحیاة (زندگی) یا الدار (گھر) ہے، اس لیے دنیا کا مفہوم الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدَّارُ الدُّنْيَا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الْآخِرُ اور الْآخِرَةُ کا مفہوم الْيَوْمُ الْآخِرُ وَالْحَيَاةُ الْآخِرَةُ وَالِدَّارُ الْآخِرَةُ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سوتیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حَيَاة (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی:

﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ﴾ (٢٩/ العنکبوت: ٦٤)

”بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔“

﴿وَلِلدَّارِ الْآخِرَةِ خَيْرٌ﴾ (٦/ الانعام: ٣٢)

”اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔“

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿أَرْضِيئُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (٩/ التوبة: ٣٨)

”کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔“

❁ قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں وہاں ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔



﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالْآخِرَةُ وَأَتْرَفْنَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

(۲۳/ المؤمنون: ۳۳)

”جنہوں نے انکار کیا اور پھجیلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔“

ان آیتوں میں الحیاة الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے، کہ الاخرۃ سے مراد الحیاة الاخرۃ یعنی پھجیلی زندگی ہے۔ اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿يَعْتَبُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۲۷)

”جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات کلمہ توحید پر مضبوط رکھے گا۔“

اس آیت میں ”آخرت سے مراد“ عالم برزخ“ ہے اور قرآن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قول ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لیے اس آیت میں ”آخرۃ“ سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ”قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔“

یوم آخر اور حیات آخر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ

دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں مذکور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے: ﴿وَجِئْنَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۳/ آل عمران: ۴۵) ”دنیا اور آخرت میں معزز۔“ سلسلہ دعائیں ہے:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (۲/ البقرة: ۲۰۱)

”پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔“ کفار کے بطلان عمل کے ذکر میں ہے:

﴿حِطَّتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۷) ”ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔“

﴿اشْتَجَبُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ﴾ (۱۶/ النحل: ۱۰۷) ”انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔“

﴿تَحْنُ أُولَئِكَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (۴۱/ خم السجدة: ۳۱)

”ہم تمہاری قریب کی زندگی اور پھجیلی زندگی کے دوست ہیں۔“

اور کبھی دنیا کے بجائے ”اولیٰ“ (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا:

﴿فَأَحَدَهُ اللَّهُ تَكَانَ الْآخِرَةُ وَالْأُولَى﴾ (۷۹/ النازعات: ۲۵) ”تو خدا نے اس کو پھجیلی زندگی اور پہلی زندگی کی مزہ بنایا۔“

﴿وَأَنْ لَّنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولَى﴾ (۹۲/ البیل: ۱۳) ”اور ہمارے ہی لیے ہے پھجیلی اور پہلی زندگی۔“

ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی فضاة القبر: ۲۳۰۸؛ ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب القبر والبلی:

۴۲۶۷؛ مسند احمد، ج ۱، ص ۶۳؛ کنز العمال، ج ۸، ص ۹۵۔

ریشہ پنخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو حقیقتاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت و فنا نہیں، پہلے دور کا نام ”برزخ“ اور دوسرے کا نام ”بعث“ یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی اُٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور اکھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿الدَّارُ الْآخِرَةُ﴾ اور ﴿عُقْبَى الدَّارِ﴾ وغیرہ ہے۔ جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراہ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنگلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدان قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلہ علق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا پاری ہوگی دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوگی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہوگی، چنانچہ سورہ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے:

﴿سَنَعِدُّبَهُمْ قُرَّةَٔٓئِينَ ثُمَّ يَرُدُّوْنَ اِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (۹/ التوبة: ۱۰۱)

”ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

اُن تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

## برزخ

”برزخ“ کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورہ رحمن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا:

﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيْنُ ۗ﴾ (الرحمن: ۲۰)

”ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔“

اسی عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورہ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا وَهَامٌ اٰجَاجٌ ۗ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا  
وَوَجَّعَ بَيْنَهُمَا سِدْرًا ۗ﴾ (الفرقان: ۵۳)

”اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور

ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔“

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ”برزخ“

ہے سورہ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿وَمَنْ وَّرَاٰهُمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمٍ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون: ۱۰۰)

”اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ قیامت میں اٹھائے

جائیں گے۔“

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام

”قبر“ ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قبر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۗ﴾ (حج: ۷)

”بے شبہ اللہ ان کو قبروں میں ہی اٹھائے گا۔“

اب ظاہر ہے کہ یہ ”بعث“ صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودہ خاک کے اندر دفن ہوں

بلکہ ہر میت کے لیے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت و حیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دو زنیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

﴿قَالُوۡا رَبَّنَا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ اٰنۡتَنِيۡنَ وَاٰحۡبِيۡتَنَا اٰنۡتَنِيۡنَ فَاَعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَاَهۡلِ اِلٰى حُرُوۡبٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ۝﴾

(۴۰ / المؤمن: ۱۱)

”ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔“

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے:

﴿ كَيْفَ تَلْفُتُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

(۲ / البقرة: ۲۸)

”کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا، انسان بنا کر پیدا کیا تم کو مار دے گا پھر تم کو جلانے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ ماوہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاَنْتُمْ مَيِّتُونَ ۗ ثُمَّ اَنْتُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ۗ ﴾

(۳۹ / الزمر: ۳۰، ۳۱)

”بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔“

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۗ ثُمَّ اَنْتُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۗ ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۱۵، ۱۶)

”پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔“

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

### نیند اور موت کی مشابہت

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک اور اک و احساس کا اور دوسرے تدبیر و تغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات اور اک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردش کی مادی دنیا سے یک سر بیگانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذارسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری

تعلق ہے اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثْكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۗ ﴾

(۶/ الانعام: ۶۰)

”اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تا کہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔“

اس سے زیادہ تفصیل سورہ زمر میں ہے:

﴿ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا فِيمُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا

الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ ﴿۴۲﴾

(۳۹/ الزمر: ۴۲)

”وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے پینک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے ”برزخ“ کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گناہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا:

﴿ قَالُوا يَا لَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا ۗ ﴾ (۳۶/ یس: ۵۲)

”اے ہماری خرابی! کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔“

غزوہ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل کر اپنے قتل میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

﴿ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۗ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۵۴)

”کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔“

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر لفظ ”بعث“ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں ❁ جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ لَئِنَّكُمْ يَرْجِعُونَ فِيهِ﴾

(٦٠/ الانعام: ٦٠)

”اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔“

﴿وَإِنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ﴾ (٢٢/ الحج: ٧)

”اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، جگا لے گا۔“

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکو کاروں سے کہا جاتا ہے کہ ((نَمْ كُنْوْمِي الْعَرُوسِ)) ”دہن کی نیند سو جاؤ۔“ جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ ❁

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل و عمیق نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت والم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادراک و احساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح منٹھل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ ہو، ہو، ہو ہی جسم کو دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد، رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں

❁ صحیح بخاری، کتاب النهجد، باب تحریض النبی ﷺ علی قیام اللیل: ١١٢٧ میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب سے نماز تہجد کے لیے اس وقت تک بیدار رہنے پر سوال فرمایا تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! انفسنا بیدالله فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا۔ ”ہماری روہیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے۔“ اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔ ❁ جامع ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء عذاب القبر: ١٠٧١ حدیث حسن غریب۔ ❁ شاہ ولی اللہ صاحب تجرید اللہ الباقی میں لکھتے ہیں: فهذا المبطلی فی الرؤیا غیر انها رؤیا لا یقظة منها الی یوم القيمة۔ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ، ج ١، ص: ٢٧) یعنی ”یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔“



کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً: اگر بگم کی زیادتی ہو تو پانی دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی صورتیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے تغیرات غلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ ❁

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اثر دھان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں پلینتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شب معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی ❁۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً: غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿وَلَا يَغْتَبُ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾

(۴۹/ الحجرات: ۱۲)

”اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برانہ کہے، کیا تم میں سے کوئی پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوج نوج کر کھائے سو گھن آئی تم کو۔“

اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط﴾

(۲/ البقرة: ۲۷۵)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھود دیئے ہوں۔“

تیبیوں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرا فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾

(۴/ النساء: ۱۰)

”وہ لوگ جو تیبیوں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی

❁ حجة الله البالغة شاء ولي الله ﷺ ذكر برزخ، ج ۱، ص: ۲۷۔

❁ صحيح بخاری، كتاب الصلوة، باب كيف فرضت الصلوة في الاسراء: ۳۴۹۔



آگ میں داخل ہوں گے۔“

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے دردِ درنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل پکیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے دوزخ میں ان کو زخموں کا دھون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۖ وَلَا يَحِضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۖ فَكَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَهُنَا حَمِيمًا ۖ وَلَا طَعَامًا إِلَّا مِنْ غَسِيلِينَ ۖ لَا يَأْكُلُ إِلَّا الْخَاطُونَ﴾ ﴿٦٩/ الحاقة: ٣٣-٣٧﴾

”بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے سوا کوئی کھانا ہے، اس کو وہی گناہگار کھائیں گے۔“

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَحْمِيَتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ يَرَوْنَهَا ۖ﴾ ﴿٢/ البقرة: ٢٦٥﴾

”اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔“

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مر جانے والوں کو جان و نوا اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَقْوُوا لِمَنْ يَفْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ﴾ ﴿٢/ البقرة: ١٥٤﴾

”جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں۔“

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا۔ جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا اللہ اس کی ستاری کرے گا۔ قرآن و احادیث اس قسم کی بالعاوضہ جزا اور سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، ان کی نسبت فرمایا:

﴿سَيَطُوفُونَ مَا حَجَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ﴿٣/ آل عمران: ١٨٠﴾

”جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔“

﴿يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۗ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا تَفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ ﴿٩/ التوبة: ٣٥﴾

”جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان کی

پیشانیوں اور پہلو اور پٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔“

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نایمانی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے جنت سے نکلنے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي فَان لَهُ مَعِيشَةٌ ضَنُكًا وَخَشْرَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْلَى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْلَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيَهَا ۝ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْفَسَى ۝﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٤، ١٢٦)

”اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیے تنگ گزران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا، میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ خدا کہے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔“

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْلَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْلَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝﴾

(١٧ / بنی اسرائیل: ٧٢)

”جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔“

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا:

قال رسول الله ﷺ ((من اتاه الله مالا فلهم يؤذ زكاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة ياخذ بلهز متيه اى شدقيه يقول انا مالك انا كنزك))

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا، جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبرؤں کو کاٹے گا اور کہے گا، میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔“ ❁

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً: یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر دہانے بائیں سے نمودار ہوں گے \* یہ بھی حدیث میں ہے کہ ”مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الہی مرد کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے مثلاً الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوبِهَا نیک مرد و مسلمان اس ننگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔“ \* یہ ظاہر ہے کہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مرد کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں

اوپر کے بیانات سے ہو یاد ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً: ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

((ذَلِكَ عَمَلُهُ)) \* ”یہ نہر، ان کا (نیک) عمل ہے۔“

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس روئے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جو اب بھی قائم ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو فرمایا:

”رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگادیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبرے کو پھر نینتے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ جیتنے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جھسی سرخ نہر بہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے

\* مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۳۵۲۔ \* سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب ذکر القبر والبلوی: ۴۲۷۲۔

\* صحیح بخاری، کتاب التعبير، باب رؤیا النساء: ۷۰۰۴۔

مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کھلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھانک پر پہنچے دروازہ کھلوا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ”جنت عدن“ ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سپید لکڑی ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔ پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گلہ پھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں تنگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا وہ منہ سے پتھر نگتا تھا وہ سو خواری ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ کمن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے۔“ کسی صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ”اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ ایسے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔“ ❁

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نماز صبح سے غافل ہو کر بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلہ پھڑا اچھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سو خواری کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا اپنا دباؤ بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوائے عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے اور

❁ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوة الصبح: ۷۰۴۷۔

صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرت الہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔ ❀ ابھی تک دنیائے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ”آفاقی“ یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیاء کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے نفس کہا ہے ان نفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے۔ ہماری سائیکالوجی علم انفس ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ ہر اور اس پر پروجیٹزم (علم ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے بہر حال ابھی تک علم نفس و روح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلی کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔ بہر حال نفس انسانی کے اندرونی قوی کا علم گویا ابھی بہت کچھ محتاج تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت سا شدید تعلق ہے، مسمریزم نے جو سراسری اصول پڑنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین۔ کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آ جائے جس میں پھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے۔ قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۃ النکاثر میں بیان کیا ہے:

﴿ اَلْهٰكُمُ النَّكَٰثِرُ ۗ ۙ حٰثِي زُرُوْمُ الْمَقٰیِرُ ۗ ۙ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۗ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۗ ۙ كَلَّا ۗ لَوْ تَعْلَمُوْنَ ۗ ۙ عِلْمَ الْيَقِيْنَ ۗ ۙ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۗ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنَ ۗ ۙ ﴾

(۱۰۲ / النکاثر: ۱-۷)

”تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جادیکھا ابھی نہیں تم آگے جان لو گے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لو گے ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لو گے۔“

نابریں اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی

آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے:

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾ (النکاح: ۶۰، ۵)

”نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔“

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحی الہی نے اس کے جواب میں کہا:

﴿يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَكَيْطٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ (العنکبوت: ۵۴)

”وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔“

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان میں سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَكَيْطٌ

بِالْكَافِرِينَ﴾ (التوبة: ۴۹)

”اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور

آزمائش میں نہ ڈال لے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔“

لیکن یہ علم یقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتر ہے اس کے منکر ہیں اس لیے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آ جائیں گے اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے:

﴿لَمَّا تَرَوُهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ (النکاح: ۷)

”پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لو گے۔“

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا:

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ (الطارق: ۹) ”جس دن تمام بھید کھل جائیں گے۔“

اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آ جائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی

باقی نہ رہے گا وہ علم حقیقی اور یقین حقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

﴿ وَنُفِعَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمَ الْوَعِيدِ ۖ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ۚ لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكُفِّرُوا عَنْكُمْ غِطَاءَكُمْ فَبَصَرُكُمُ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ ﴾

(۵۰/ق: ۲۰-۲۲)

”اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔“

اس پردہ کے بجٹے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی، فرمایا:

﴿ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۙ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ ۚ وَبُورِزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَأْتِي ۝ ﴾ (۷۹/النازعات: ۳۴-۳۶)

”جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔“

احوال برزخ کا عین الیقین

ایک طرف شاعر (ابوالغائبہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وکل الناس داخله  
يليت شعري بعد الباب ما الدار  
”موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون سا گھر ہے۔“

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو جس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

﴿ حَلَىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۚ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۗ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ ﴾

(۲۳/المؤمنون: ۹۹، ۱۰۰)

”جب ان گناہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے، تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور اب ان گناہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت

کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی، تو اس کا شک و شبہ و فتنہ یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۝﴾ (۱۹:۵۰/ق:۱۹)

”اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آگئی یہی ہے وہ جس سے تو بھاگتا تھا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ”حقیقت“ کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاخرة فتبينه للانسان حتى تثبتته وعرفه. ❁

”حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان

اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔“

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عز وجل وجاءت ايها الانسان سكرة الموت بالحق اي كشفت لك

عن اليقين الذي كنت تمتري فيه. ❁

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آگئی یعنی تیرے اس یقین

کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔“

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ما جاءت به

الرسول من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد. ❁

”اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس

قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لے کر آئے تھے۔ ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔“

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر (ج ۲۶، ص: ۱۶۵) کی عبارت یہ ہے:

والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقت به كتب الله

تعالى ورسله عليهم السلام.

”اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی بد ہوشی اس حقیقت امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ

تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔“

❁ تفسیر ابن جریر، طبری، ج ۲۶، ص: ۹۱۔ ❁ تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان، ج ۹، ص: ۲۹۸۔

❁ تفسیر شوکانی، ج: ۵، ص: ۷۳۔



زنجبری معترلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر (نحر محیط ج ۸ ص ۱۲۳ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

﴿فَلَنَسْفَعْنَا عَنْكَ غُطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (۵۰/ق: ۲۲)

”ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر ”خدا کی طرف بازگشت“ یعنی اللہ کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:

﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَتَعَرَّوْنَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مَلَأْتُكُمْ ثُمَّ تُرْجَوْنَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (الجمعة: ۸)

”کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔“

﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ (البقرة: ۱۵۶)

”ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔“

﴿إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا﴾ (المائدہ: ۱۰۰)

”تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

یہ طرز او ایسی آیات میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زور اور ہوا صرف وہی ہوگا جو اس دنیا کے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَقَّعُكُمْ بِالْأَيْدِي وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ

تُسَمِّي ۚ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦﴾ (٦/ الانعام: ٦٠)

”اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال بتائے گا۔“

ایک اور آیت میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغِيكُمُ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ لَا تَتَّبِعُوا هَوَا الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠﴾ (١٠/ بونس: ٢٣)

”اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال بتائیں گے۔“

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آ جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری جلد ۱۱ ص ۶۲ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گناہگاروں کی رو میں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ النَّرَاقِيَ ۖ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ۖ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقِيَ ۖ وَالنَّفْيَ السَّاقِيَ ۖ

بِالسَّاقِيَ ۖ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقِيَ ۖ ﴿٧٥﴾ (٧٥/ القيامة: ٢٧-٣٠)

”ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسی) تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لیٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔“

لیکن سعید اور نیکو کاروں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۖ ﴿٢٧﴾

(٢٧/ الفجر: ٢٧، ٢٨)

”اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا۔“

یہ کیسی دلاؤ ویز صد اور کیسی واپسی ہوگی۔

## اس وقت کا سماں

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرَجُوا أَنفُسَكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ تُجْزَوْنَ عَذَابَ أَلْوَنٍ ۚ إِنَّهُمْ تَفْؤُلُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٤﴾  
وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ﴿٩٥﴾﴾

(٦/ الانعام: ٩٣، ٩٤)

”اور کبھی تو دیکھیے جس وقت گناہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان واسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مفرور بنایا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔“

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ يَتَوَقَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةَ يَصْرِيحُونَ وَمَجْهُرَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۖ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيِدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٥١﴾﴾

(٨/ الانفال: ٥٠، ٥١)

”اور کبھی تو دیکھیے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا انہوں کو کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکو کاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے:

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ﴿١﴾ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ﴿٢﴾ وَسَخْنُ أَقْرَبَ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا

تُبْصِرُونَ ۚ فَلَوْلَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۙ تَرْجِعُونَهَا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقْرَبِينَ ۙ فَرَوْحٌ وَّرِيحَانٌ ۙ وَوَجَّهْتُ لِعِيْمِهِ ۙ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ اصْحَابِ الْيَمِينِ ۙ فَسَلَّمَ لَكَ مِنَ اصْحَابِ الْيَمِينِ ۙ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكْذِبِينَ الصَّالِينَ ۙ فَتَزُلُّ مِنْ حَيْبِهِ ۙ وَتَضْلِيَةٌ حَجِيْرٍ ۙ اِنَّ هَذَا لَهَوَّ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۙ ﴿

(۵۶ / الواقعة: ۸۳-۹۵)

”پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار و تکذیب میں سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہو تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہو تو تجھ پر سلامتی دہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔“

یہ تمام سال موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

### برزخ کا عذاب و راحت

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

﴿سَنَعِدُّهُمْ مَّرَاتِنَ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۙ﴾ (۹ / النوبة: ۱۰۱)

”ہم ان کو دو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“

﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پڑا اور گزر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

﴿وَكَاٰنَ يٰۤاِلَٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْءَ السَّوْءِ الْعَذَابِ ۙ اَلَّذِيْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۙ وَيَوْمَ تَقُوْمُ

السَّاعَةِ ۙ اَدْخَلُوْا اِلَٰلِ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۙ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۴۵، ۴۶)

”اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے

ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکو کاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت نے فرمایا ہے: ”تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے۔ ﴿ ایک اور صحیح حدیث میں ہے: ”جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے ﴿ اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں اس پر سرسبزی بھردی جاتی ہے۔“ ﴿

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الہی سچ ہے تم ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے۔ جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے اس لیے ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَقُولُونَ حَسْرًا مِّنْ أَمَّا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَبَعَلْنَا حَبًا مَّنْثُورًا ﴿ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقْرَرًا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا ﴿ وَيَوْمَ تَنفَخُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزُلُ الْمَلَائِكَةِ تَنزِيلًا ﴿ الْمَلِكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ ﴿ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا ﴿﴾

(۲۵/ الفرقان: ۲۲-۲۶)

”جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گناہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار بے سود معدوم) جنت والے لوگ یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے

﴿ صحیح مسلم، کتاب الجنة والنار، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱۱، ۷۲۱۲؛ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر: ۱۰۷۲؛ حدیث حسن صحیح؛ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب المیت یرض علیہ مقعدہ بالغاۃ والعشی: ۱۳۷۹؛ وکتاب الرقاق، باب سكرات الموت: ۶۵۱۵۔ ﴿ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ۱۳۷۴۔ ﴿ صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱۶۔

جائیں گے اس دن راج سچے خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔“  
کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے اب اس سے پہلے  
فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گناہگاروں کے لیے خوشخبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا  
منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر قرار گاہ اور دو پہر کی دھوپ سے  
بچانے والی خواب گاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورہ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گناہگاروں کی روحوں کو  
قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پٹیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهُهُمْ وَأَذْبَارَهُمْ ۗ ذَلِكَ بِأَنَّهُم اتَّبَعُوا مَا آسَفَطَا  
اللَّهُ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۗ﴾ (٤٧/ محمد: ٢٧، ٢٨)

”پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پٹیٹھوں پر مارتے  
ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور  
جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔“  
یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہر حال اس سے  
یہ ثابت ہے کہ گناہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔ سورہ انعام میں اس  
سے زیادہ ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوَ أَيْدِيهِمْ أَخْرَجُوا أَنفُسَهُمْ  
الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ﴾ (٦/ الانعام: ٩٣)

”اور اگر تو دیکھے جب گناہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو  
اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔“

الْیَوْمَ جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن  
سے روح نکالتے ہیں، اس ”آج“ سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ  
برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی) تو م نوح کے غرق  
ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

﴿أَعْرِضُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَكَمْ يَجِدُوا لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا﴾ (٧١/ نوح: ٢٥)

”وہ ڈوب دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔“  
حضرت لوط اور حضرت نوح ﷺ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

﴿وَوَيْلٌ إِذْ خَلَا الثَّآكِرُ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ۗ﴾ (٦٦/ التحريم: ١٠)

”اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔“

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام ”برزخ“ ہے۔ سورہ یس میں ایک ”خیر خواہ“ قوم کا ذکر ہے جو عمر بھرا اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا، کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

﴿قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۗ قَالَ يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ۗ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۗ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهَا مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ۗ﴾

(۳۶/یس: ۲۶-۲۸)

”کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا، اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا، کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔“

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

﴿بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرَوُّوْنَ قَوْلَهُ ۗ﴾ (۳/آل عمران: ۱۶۹)

”بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکو کاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

﴿الَّذِينَ كَتَبْنَا لَهُمُ الْكُفْرَةَ أَطْيَبِينَ يَفْقَهُونَ سَلَامًا عَلَيْهِمْ ۗ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ﴾

(۱۶/النحل: ۳۲)

”جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔“

### تبرکي اصطلاح

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں۔ وہ عموماً قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان

کئے گئے ہیں۔ بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور ان کی دلیل تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اس قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

ہوئی ہیں لیکن، اس لفظ ”قبر“ سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح و نفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا شفیق ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ وہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا ﴿اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ (۷۴/ المدثر: ۳۸) یعنی ”ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروہی۔“ اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم صرف بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ یا مادیات سے پاک و بری ہوگا، تاہم اس کو اپنے خاکی جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اور پر گزر چکی ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَبْعَثُ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةَ يَتْرِكُونَهُمْ وَجُوهَهُمْ وَأَذْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (۸/ الانفال: ۵۰)

”اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔“

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاش کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر کی روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو،

اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے، لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم گل سزا جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔



یہی مفہوم صاف لفظوں میں اسی آیت میں ہے:

﴿إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ﴾ (۷۵/ القیامۃ: ۳۰)

”اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے، ہنکا یا جانا۔“

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ ”مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔“ اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرش الہی کی قدیمیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو روایاے صادقہ پہلے گزرا ہے اس میں جن جسمانی قابلوں میں گناہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور ان گناہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب و اجسام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں گل سڑ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہو جائیں اور منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزو بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑادی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جاسکے، مگر قدرت الہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ ❁

### سوال و جواب

احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔“

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

﴿الَّذِينَ تَتَوَكَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلْبِينٌ يَّقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُونَ﴾ (۱۱۶/ النحل: ۳۲)

”جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر

❁ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فیما یقال عند المریض اذا حضر: ۱۴۴۹۔

❁ صحیح بخاری، کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ: ۶۴۸۰-۶۴۸۱۔

سلامتی ہوا اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔“  
 ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُم مَّا كَانُوا فِيهَا يَسْتَعْجِلُونَ فِي  
 الْأَرْضِ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَرَى اللَّهَ وَنَعْلَمُ مَا هِيَ إِلَّا حَقٌّ وَمَا هِيَ إِلَّا  
 جَهَنَّمُ ۗ﴾

(۴/ النساء: ۹۷)

”بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔“  
 ایک اور آیت ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَهُمْ مَا كَانُوا يُسْرِئُونَ مِمَّا قَالُوا أَنَّهُمْ قَالُوا  
 ضَلُّوا عَنَّا وَكَلَّمُوا شُرَكَاءَ آلِهَتِهِمْ كَانُوا كُفْرِينَ ۗ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ  
 قَبْلِكُمْ مِنَ النَّارِ وَالْأَنْبِيَاءِ فِي النَّارِ ۗ﴾ (۷/ الاعراف: ۲۷، ۲۸)

”یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔“

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے، کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی یہ کہ توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں، اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

﴿يَسِّرُ اللَّهُ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ  
 الظَّالِمِينَ ۗ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۲۷)

”اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔“

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔ ہر چند کہ رسول کریم ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ”قول ثابت“ پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے آخرت قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہل ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار، آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا تھا، جہاں ہنوز اسرارِ پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے۔ اس آیت مبارکہ کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔ حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی رگوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا نُفَعِّقُ لَهُمْ آيَاتِ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلْبِغُوا الْعَمَلُ فِي سَمَوَاتِنَا ط﴾ (٧/ الاعراف: ٤٠)

”بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے نکلے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔“

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی رگوں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی

کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمدن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الہی کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں صدا دیتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ! ارجعي إلى ربك راضيةً مرضيةً ۗ فإدخلي في عديتي ۗ  
وإدخلي جنتي ۗ﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰)

”اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جاؤ، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔“  
ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عیشوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جائے گی۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتٌ ۗ بَلْ أحياءٌ ۗ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۗ﴾

(البقرة: ۱۵۴)

”جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔“

یہ پرست زندگی کسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتًا ۗ بَلْ أحياءٌ ۗ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرزقُونَ ۗ فَرِحِينَ  
بِمَا أَنَّهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۗ أَلَا خَوْفٌ  
عَلَيْهِمْ ۗ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ  
الْمُؤْمِنِينَ ۗ﴾ (آل عمران: ۱۶۹، ۱۷۰)

”اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں، کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔“

یہ پرست زندگی شہدا کو ملے گی اس زندگی کا مقام ”خدا کے پاس“ بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں

جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرش الہی کی قدیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدائے ہر حال اعلیٰ اور برتر ہیں اس لیے ان کا مقام بھی اسی احاطہ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سیر معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔ بعض وہ سعید روہیں ہوں گی جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں سے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں ان کے جسم سے اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَكْفُلُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشُرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ مَحْسُنٌ أُولَئِكَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَكَمْ فِيهَا مَنَّا تَنَسَّهَىٰ أَنفُسَكُمْ وَكَمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ۝ ﴾ (٤١ / ختم السجدة: ٣٠، ٣١)

”بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔“  
یہ آوازہ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

## 2 آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

### قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ تو میں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض۔

ہزار شمع بکشتند وانجمن

باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان وزمین کے کڑے نکر کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر، ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنسٹوں) کو ہو سکتا ہے مگر اہل فلسفہ کا بڑا گروہ بھی اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہل سائنس بھی اس امکان کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیبت جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں اور اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے اس نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ یہ گرم آفتاب ہے اور اس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور نضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ باہمی توازن باقی نہ رہے گا اور اس وقت تمام کڑے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس نضائے کرڈوں ستارے تیر رہے ہیں، ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا۔

ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ہبائے منتوراً ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسباب طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہل سائنس کے نزدیک بھی امکان، بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہل مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا جملہ تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور اس میں اس کو ”عدالت کا دن“ کہا گیا ہے۔ ﴿ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک ”صدوقی“ جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا مگر دوسرا فرقہ جو ”فریسی“ کہلاتا تھا بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا ﴿ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو اور تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا دے گا کہ ”میں ہوں بادشاہ۔“ ﴿ انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے ﴿ اور مکاشفات یوحنا میں قیامت کے احوال و احوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو ”پرلے“ کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم انبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

### قیامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورہ میں ہے، وہ یوم الدین ہے یعنی ”جزا کا دن“ جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں:

اَلْسَاعَةَ وَهِيَ (وہ مقررہ وقت)

يَوْمَ الْقِيَامَةِ (کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن))

اَلْيَوْمَ الْحَقِّ سِجَادِن (جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)

﴿ زبور: ۱۶، ۱۷، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۴۹، ۵۰۔ ﴿ انجیل مرقس: ۱۲، ۲۴، ۲۳۔

﴿ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ زمر: ۴۸۱۱، ۴۸۱۲۔

﴿ متی: ۲۲، ۳۱، ۳۲؛ لوقا: ۲۰، ۲۷؛ مرقس: ۱۲، ۱۸۔

جانا ہوا دن یا مقررہ دن	يَوْمٌ مَّعْلُومٌ
جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت	الْوَقْتُ الْمَعْلُومُ
موجودہ دن	الْيَوْمُ الْمَوْعُودُ
پچھلا دن	الْيَوْمُ الْأَخِيرُ
قریب آنے والی مصیبت کا دن	يَوْمُ الْأَزِيْقَةِ
ایک سخت دن	يَوْمٌ عَسِيْرٌ
ایک بڑا دن	يَوْمٌ عَظِيْمٌ
سخت دن	يَوْمٌ عَصِيْبٌ
جی اٹھنے کا دن	يَوْمُ الْبُعْثِ
انسوس کا دن ❁	يَوْمُ التَّغَابِيْنِ
باہم ملنے کا دن	يَوْمُ التَّلَاقِ
پکار کا دن	يَوْمُ التَّنَادِ
اکٹھے ہونے کا دن	يَوْمُ الْجَمْعِ
حساب کا دن	يَوْمُ الْحِسَابِ
حسرت کا دن	يَوْمُ الْحَسْرَةِ
قبروں سے نکلنے کا دن	يَوْمُ الْخُرُوْجِ
فیصلہ کا دن	يَوْمُ الْفُضْلِ
کھڑکھڑانے والی	الْقَارِعَةُ
چھا جانے والی	الْعَاشِيَةُ
بڑی مصیبت	الطَّامَةُ الْكُبْرَى
بڑی خبر	النَّبَأُ الْعَظِيْمُ
ضرور آنے والی گھڑی	الْحَاقِقَةُ
وعدہ	الْوَعْدُ
دفعہ پذیر	الْوَاقِعَةُ
خدا کی بات	أَمْرُ اللَّهِ

❁ نام مترجمین نے ہر جیت کا دن لکھا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے نقصان اٹھانے کا دن لکھا ہے اسی سے اس میں حسرت و انسوس کا مفہوم بھی شامل ہوا۔



الضَّاحَّةُ بہرا کرنے والی گھڑی

قیامت کے اوصاف

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً:

﴿يَوْمَ يَنْفَعُ فِي الصُّورِ﴾ (٦/ الانعام: ٧٣-٢٠ / ظہ: ١٠٢-٢٧ / النمل: ٨٧)

”جس دن زرسنگا پھونکا جائے گا۔“

﴿يَوْمَ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴾ (٥/ المائدہ: ١١٩)

”جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔“

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ (٢٦/ الشعراء: ٨٨)

”جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔“

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٢٧)

”جس دن گناہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔“

﴿وَيَوْمَ تَشْقُقُ السَّمَاءُ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٢٥)

”جس دن آسمان پھٹے گا۔“

﴿وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٥١)

”اور جس دن گواہ کھڑے ہونگے۔“

﴿لِيَوْمِ لَأَرْبَبٍ فِيهِ﴾ (٣/ آل عمران: ٩)

”جس دن میں کوئی شک نہیں۔“

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُونَ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا﴾ (٢٧/ النمل: ٨٣)

”جس دن ہر قوم سے ایک گروہ بواکٹھا کریں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (٨٣/ المطففين: ٦)

”جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔“

﴿يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ﴾ (٥٤/ القمر: ٧)

”(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ الْعَرْسُ مِنْ أَخِيهِ ۖ وَأَقْبَهُ ۖ وَأَبِيهِ ۖ وَصَاحِبَتِهِ ۖ وَيَنِيهِ ۖ﴾

(٨٠/ عبس: ٣٤-٣٦)

”جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹیوں سے بھاگے گا۔“

﴿يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا﴾ (٢/ البقرة: ١٢٣)

”جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔“

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ﴾ (النور: ۲۴)

”جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔“

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ لَّيْقِينِ شَيْئًا﴾ (الانفطار: ۱۹)

”جس دن کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔“

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَىٰ عَنْ مَوْلَىٰ شَيْئًا﴾ (الدخان: ۴۱)

”جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔“

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض، یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آ جائے گا:

﴿الْقَارِعَةُ ۗ مَا الْقَارِعَةُ ۗ وَمَا أَذْرِكُ مَا الْقَارِعَةُ ۗ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوتِ ۗ

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۗ﴾ (القارعة: ۱-۵)

”متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روٹی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔“

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۗ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۗ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۗ

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۗ﴾ (الزلزال: ۱-۴)

”جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن زمین اپنی حالت بیان کرے گی۔“

﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۗ وَأَذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحَقَّتْ ۗ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۗ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا

وَسَخَّلَتْ ۗ﴾ (الانشقاق: ۱-۴)

”جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری

کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ ڈال دے گی اور وہ خالی ہو جائے گی۔“

﴿ إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۚ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۚ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۚ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعِثَتْ ۚ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۗ ﴾ (۸۲/ الانفطار: ۱-۵)

”جب آسمان پھٹ جائے گی اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب دریا چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس وقت جان لیں گی۔“

﴿ إِذَا الْقَمُوسُ سُورَتْ ۚ وَإِذَا الْجُودُ انْكَدَرَتْ ۚ وَإِذَا الْبِحَالُ سُيِّرَتْ ۚ ﴾

(۸۱/ التکویر: ۱، ۳)

”جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔“

﴿ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ۚ فَإِذَا الْبُحُورُ طُيَسَتْ ۚ وَإِذَا السَّمَاءُ فُجِرَتْ ۚ وَإِذَا الْبِحَالُ نُسِفَتْ ۚ ﴾

(۷۷/ المرسلات: ۷-۱۰)

”جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔“

﴿ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۚ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۚ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ ﴾ (۷۵/ القيامة: ۷-۹)

”جب نگاہا ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیے جائیں گے۔“

﴿ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْلِ ۚ وَتَكُونُ الْبِحَالُ كَالْعِهْنِ ۚ ﴾ (۷۰/ المعارج: ۸، ۹)

”جب آسمان گچھے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روٹی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔“

﴿ فَإِذَا انْفَعَرَ فِي السُّورِ نَعْفَةٌ ۚ وَاحِدَةٌ ۚ وَحِيلَتِ الْأَرْضُ وَالْبِحَالُ قَدَلَّتَا ذِكَّةً ۚ وَاحِدَةٌ ۚ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۚ وَالشَّقَاتِ السَّمَاءُ فَيَوْمَئِذٍ وَآيَةٌ ۚ ﴾

(۶۹/ الحاقة: ۱۳-۱۶)

”جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس

دن کمزور ہو جائے گا۔“

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۗ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۗ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۗ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۗ اللَّهُ مُنْقِطِرٌ بِهِ ۗ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا﴾ (۷۳/ المزمّل: ۱۴..... ۱۶، ۱۷)

”جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے..... کیونکہ متقی ہو سکتے ہے، جب اس دن کا انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔“

﴿يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ﴾ (۱۴/ ابراہیم: ۴۸)

”جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔“

﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۗ﴾ (۵۵/ الرحمن: ۳۷)

”جب آسمان پھٹ جائے اور سرخ تھمٹ کی طرح ہو جائیں گے۔“

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۗ لَيْسَ لِيُوقِعْتَهَا كَإِذِهَا ۗ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۗ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۗ وَبَسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۗ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّثَبَّتًا ۗ﴾ (۵۶/ الواقعة: ۶-۱)

”جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے والی، جب زمین خوب بلائی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کیے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔“

﴿وَفُجِعَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۗ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۗ﴾

(۷۸/ النبا: ۱۹، ۲۰)

”اور آسمان کھول دیے جائیں گے اور وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔“

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی اور دنیا کی حیات موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا:

﴿يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾

(۱۴/ ابراہیم: ۴۸)

”جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک، سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔“

### قیامت کی حقیقت

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گونا گوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے:

﴿لَا أَقِيمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۖ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يَتَّخِذَ عِظَامَهُ ۖ بَلَىٰ قَدِيرٌ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ ۗ بَلَىٰ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۗ يَسْئَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ۗ فَإِذَا يَوْمُهَا بَرَقَ أَبْصَرٌ ۚ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۗ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۗ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَقَرُّ ۗ كَلَّا لَا وَزَرَ ۗ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۗ يَتَّبِعُوا الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ يَمَادِمٌ مَقَدَّمُوا ۗ وَأَخْرَجُوا عَلَىٰ الْإِنْسَانَ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ بَصِيرَةً ۗ وَكُلُوا لَعْنَىٰ مَعَادِيزِهِ ۗ﴾

(۷۵/ القیامتہ: ۱-۱۵)

”میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں، کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیے جائیں گے، انسان اس دن کہے گا، اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔“

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لؤامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفسِ لؤامہ ”یعنی ملامت کرنے والے نفس سے“ مقصود انسان کا اندر کا ضمیر ہے جو انسان کے ہر بڑے کام کے وقت اندر سے ٹمکنی و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ ”بلکہ انسان اپنے حال کو آپ خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے

اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشے، انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفس لؤ امہ ہے۔

① اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گناہگار ہوتا ہے، نیکو کار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیک نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے اور پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔ لیکن یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہگار ہوتی ہیں، نیکو کار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قوائے کمزور و مضطرب ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحات پر اب موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ، جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، وہ ایک دن فنا کے محض کے آغوش میں جا کر سونہ جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عادی و نمود آل فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لؤ امہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گناہگار ٹھہرتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصور وار جانتا ہے اور گناہگار ٹھہراتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی نقصانوں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے، اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفس لؤ امہ اس کو ملامت کرے گا۔ کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائنات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعتراف و قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورہ بالا میں نفس لؤ امہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورہ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھئے۔ ❁

② اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قوتوں کا مجموعہ ہے اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ایک

❁ مستفاد از تفسیر سورہ قیامت، مولانا حمید الدین بیہودہ ص: ۱۴، ۱۳۔

درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شکستہ رہا جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرض فنا میں آ گئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر، حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔ پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں متضاد عناصر و اخلاط کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات، روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں، تندرستی اور بیماری، دولت اور افلاس، حیات اور موت، آسمان و زمین، نیکی و بدی، خیر و شر، غرض جہر بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری، انہیں متضاد قوتی اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہوگا۔ لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں موجود ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعۃً وہ پھرا بھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچالے گیا۔ بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا۔ اجرامِ سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی۔ یہ کڑے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے مگر فساد و صلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قوتی اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہوگا، نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے سنائے گی:

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا يَا أَعْيُنَ رَبِّكَ أَوَّلَىٰ لَهَا بِوَعْدِكَ أَوْ حَيْثُ لَهَا يَوْمَئِذٍ تَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾

(۹۹/ الزلزال: ۱ تا ۸)

”جس وقت پوری زمین ہلائی جائے گی اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔“

## صورِ قیامت

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ﴾ پھر جب صور پھونکا جائے گا، صور کے لفظی معنی زسنگھا کے ہیں اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں ماہلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر زسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لیے زسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراہ میں یہ مجاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی کہ ﴿لَمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ”آج کس کی بادشاہی ہے“ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا ﴿لِلَّهِ الْوَحِيدِ الْقَهَّارِ﴾ ”اس ایک سب پر غالب آنے والے کی۔“ غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال و شدید خطرہ جنگ کے اعلان کا ہوگا اس لیے اس کے لیے لفظ صور اور زسنگھا پھونکنے کا قدیم مجاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے زسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

## عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو تو وحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرستش اور جزا و سزا سے قطعاً لاعلم تھے اور اس لیے ان میں اعمال کے خیر و شر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جن پر تمام اخلاق و معاملات کا دار و مدار ہے، عرب کا شاعر آپ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے:

اموت ثم بعث حشر

حدیث خرافة یا ام عمرا

”کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب

خرافات باتیں ہیں۔“

قریش کے ایک دوسرے شاعر نے کہا:

یحدثنا الرسول بان سنحیی

وکیف حیاة اصدقاء وهام

”رسول ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے حالانکہ صد اہم ہو کر پھر زندگی کیسی؟“

صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرة النبی ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۲۱۔



(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں صدئی

اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿عَادًا اٰمِتْنَا وَاٰمِتْنَا لَكُمْ اَبَاءٌ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ﴾ (۳۰/۵۰)

”کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ لوٹنا بہت دور ہے۔“

﴿عَادًا لَكُمْ رُدُّوْهُمْ فِي الْحَاوِرَةِ ۗ عَادًا اِنَّا عِظَامًا نَّخْرُوْهَا﴾

(۷۹/النازعات: ۱۰، ۱۱)

”کیا ہم دوبارہ اٹنے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔“

﴿عَادًا اِنَّا عِظَامًا وَّرَفَاآءًا اِنَّا لَبُعُوْثُوْنَ خُلُقًا جَدِيْدًا﴾ (۱۷/بنی اسرائیل: ۴۹)

”کیا جب ہم ہڈی اور چوراہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔“

﴿مَنْ يُؤْتِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ (۳۶/نہل: ۷۸)

”ان سڑی گئی ہڈیوں کو کون جلانے گا۔“

ان میں بعضوں کا عقیدہ وہ ربوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی

سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيٰتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰ وَمَا يَهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾

(۴۵/الحجرات: ۲۴)

”انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی

ہم کو مارتا ہے۔“

﴿وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيٰتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِبَعُوْثِيْنَ﴾ (۶/الانعام: ۲۹)

”اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔“

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا﴾ (۷۸/النبا: ۲۷)

”وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔“

خباب بن الارت، ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے

ایک رئیس عاص بن وائل پر داجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا جب تک تم محمد ﷺ کا

انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ”یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔“

اس نے کہا، کیا مر کر مجھے پھر جینا ہے؟ انہوں نے کہا: ”بے شک۔“ اس نے مذاق سے کہا، اچھا تو پھر وہیں میرا

مال و دولت اور سر و سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ ❁ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی کئی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بتکار بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ہیبت الہی، ہنگامہ قیامت اور حشر و نشر کے رست خیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذاب الہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاشرو کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہ رضی اللہ عنہم ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے۔ یہ آیت کہ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ﴾ (۵۴ / القمر: ۶) ”بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی۔“ مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کسں بچی تھی کھیاتی تھی۔ بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں، جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ ❁

اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ ٹیٹھتی اور نہ احکام الہی کی تعمیل میں دلی رجحان اور میان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿قَالَتِ نِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾ (۱۶ / النحل: ۲۲)

”تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے، ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔“

اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ تلاوت کریں، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ ”روز جزا کا مالک۔“ اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں

❁ صحیح بخاری، کتاب التفسیر تفسیر سورہ کہف: ۷۳۔

❁ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن: ۹۹۳۔

پوری طرح گھر کر لے۔

## قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہوتی تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنكُم خَالِقُونَ عِبَادًا وَأَنتُمْ كَالَّذِينَ لَا تَرْجَعُونَ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۱۱۵)

” (اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔“

﴿أَحْسَبَ الْإِنسَانُ أَن يُنْفَك سُدًى﴾ (۷۵/ القيامة: ۳۶)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑا جائے گا۔“

دوسری بات جو اس زمانہ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر ایسے برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نفوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، مگر تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گناہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکو کار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورہ وائسین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۖ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّينِ ۗ﴾

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ﴾ (۹۵/ التین: ۸-۶)

”لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔“

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجہ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

﴿أَمْ يَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ يَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفِتْيَانِ﴾ (۳۸/ ص: ۲۸)

”کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کی طرح کر دیں، جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔“  
اسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً نَحْنَاهُمْ وَمَنْهُمْ طَسَاءً مَا يَجْحَدُونَ﴾ (۴۵/ البجائیة: ۲۱)

”کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔“

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مرکز دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا، اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے انہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی ﷺ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا:

① مرکز جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیر ؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرنڈ مرکز جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مرکز جی سکتی ہے۔

② جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعۃً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے سبزے نکل آتے ہیں، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دینوں کو اگلاوے گی ﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی۔ اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

③ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

④ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقش

اول بنایا، کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

⑤ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور تو ان میں الہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے تو ان میں الہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عادی و نمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تیغ کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نکل گئی؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا:

﴿ اَوَلَمْ نَسْبُرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَانُوا هُمْ

اَشَدَّ مِنْهُمْ قَوْمًا وَاَنْتَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (٤٠ / المؤمن: ٢١)

”کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا، جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔“

﴿ اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَاُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمٍ اُتُوا بِوَعْدِ وَاَعَادُوا لِنُؤْمُرٍ وَّكَانُوا يَنْصُرُونَ ۗ وَلَئِنْ مِنْكُمْ لَشَاقِيَةٌ ۗ اَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ اَللّٰهُ ۙ

يَعْلَمُهُمْ اَلَا اللّٰهُ ۗ ﴾ (١٤ / ابراہیم: ٩)

”کیا تم کو ان کی قوم اور عادی و نمود کی اور جو ان کے بعد آئے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔“

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لِسْمِ الْمَلِكُ بجاتی تھیں، ہزار ہا سال سے بے نشان ہیں۔ نازمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ جیوس جوروم کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں رہی، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔ الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں۔ جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانون الہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گواہی فراہم کرنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنا کے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ایک

دن وہ آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی اور کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اور اس میں موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے طبعی قانون سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

﴿يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾

(۱۴ / ابراہیم: ۴۸)

”جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔“

سورہ ق میں قیامت پر استدلال انہیں دلیلوں سے کیا گیا ہے:

﴿ق وَالْقُرْآنِ الْحَمِيدِ ﴿۱﴾ بَلْ يَجْعَلُونَ كَلِمَةً كَثِيرَةً ﴿۲﴾ لَقَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ﴿۳﴾ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ ﴿۴﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كَذَّبَتْ فَكَاكُنًا ﴿۵﴾ لَقَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ﴿۶﴾ وَالسَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَرَاسَّهَا وَمَا لَهَا مِنْ قُرُورٍ ﴿۷﴾ وَالْأَرْضِ مَدَدُهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِي وَأَوْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيمٍ ﴿۸﴾ بَصُرَةٌ ﴿۹﴾ وَذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ ﴿۱۰﴾ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَبَّ وَّحَبَّ وَالْعُصْبِ ﴿۱۱﴾ وَالشَّجَرِ أَيْضًا ﴿۱۲﴾ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ﴿۱۳﴾ رِزْقًا لِيُعْبَادَ ﴿۱۴﴾ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ﴿۱۵﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَشُودُدٌ ﴿۱۶﴾ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنٌ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ﴿۱۷﴾ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُهَّيْمٍ ﴿۱۸﴾ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدُ ﴿۱۹﴾ أَفَعَيِّنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ﴿۲۰﴾ بَلْ لَمْ يَكُنْ فِي قُلُوبِهِمْ عِلْمٌ ﴿۲۱﴾ قُلْ إِنَّمَا نَحْنُ نَذِيرٌ ﴿۲۲﴾ لِقَوْمٍ عَادِلٍ ﴿۲۳﴾﴾

(۵۰ / ق: ۱-۱۵)

”قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس سے تعجب ہے کہ ان میں کا ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈر سنا تا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے، کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دروازہ عقل ہے، (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان مردہ جسوم میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی انہوں نے جھٹلادیا تو وہ انہی باتوں میں بڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور

کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلا یا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اُگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوچہ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا پھر اس سے باغ اور کھیت کھیت کے اناج اُگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکلتا ہوگا، ان کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری دھمکی پوری اتری، کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔“

سورۃ قیامتہ میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

﴿أَيَسَّبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۚ أَلَمْ يَكُنْ نَطْفَةً مِّنْ مَّوَدِّئِنِّي ۖ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً مَّغْلَقًا ۖ فَسَوَىٰ ۖ فَبَعَلْ مِنْهُ الزُّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۗ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُثَبِّتَ الْمَوْتَىٰ ۗ﴾

(۷۵ / القیامتہ: ۳۶-۴۰)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا، یعنی زراور مادہ کیا یہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟“

﴿وَقَالُوا إِذًا أَكُنَّا عِظَامًا وَرِقَاقًا وَأَنَا لَبِئْسُ الْبُحُورُونَ خَلَقْنَا جَدِيدًا ۗ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۗ﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۹۸، ۹۹)

”اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے، تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدُؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۗ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۗ﴾ (۳۰ / الروم: ۲۷)

”اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا، یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے بہت آسان ہے۔“

﴿إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ (۲۲ / الحج: ۵)

” (لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو (پہلے) تم کو اسی مردہ مٹی سے پیدا کر چکے ہیں، (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔)“

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُغْنِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۗ قُلْ يُغْنِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ﴾

(۳۶/ بقرہ: ۷۸، ۷۹)

”وہ بولا کہ کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلایے گا، کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔“

غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

### حشر جسمانی

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی اور جہاں جسم و جسمانیات کا مطلق گزرنہ ہوگا۔ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو۔ کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مگر پھر جئے گا؟ کیا ہماری ان سڑی گئی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح چھوٹکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تجزیل ان کے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تجزیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سر تا پا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لیے مصلحت الہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے اور کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿وَقَالُوا آءِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدَةٍ ۗ بَلْ هُمْ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ لَكْفُورُونَ ۗ﴾

(۳۲/ السجدة: ۱۰)

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہونگے

(خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں) بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

غور کرو کہ ان مادی و معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ

شکوک و شبہات اس لیے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے



ان کو انکار ہے اور خواہی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ تُعَلِّمُوهُ مَا رَكِبْتُمْ لِيُرْسِلَنَّكُمْ تَرْتَجِعُونَ﴾

(۳۲/ السجدة: ۱۱)

”خواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔“

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدہ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہیں باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جونگا ہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے وہ بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس ہی پر اس نا دیدہ شہرستان بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔ جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا، بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔ موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی، تو ظاہر ہے کہ موت آنے کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت و کیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیات ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گوروح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لیے آلات و اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعل لذت و الم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت و الم کا کوئی روحانی احساس جسمانیات کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح کا محض جنت کی لذتوں سے متنوع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جلدت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر و شکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

## جسم و جسد

حشر جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اس دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر مؤاخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت و الم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رویا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے انہیں خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

## خلق جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے:

﴿بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (۱۵۰/ق: ۱۵۰)

”بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔“

منکرین کی زبان سے کہلویا:

﴿وَأَنَا لَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا﴾ (۱۷/الاسراء: ۹۸)

”کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔“

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:

﴿إِنكُم لِرَبِّیْ خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (۳۴/سبأ: ۷)

”بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔“

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ﴾ (۲۱/الانبیاء: ۱۰۴)

”جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔“

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے اور

نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ”جسم“ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گزشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصَلِّيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (٤/النساء: ٥٦)

”بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے، ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم کا جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے

یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا وہ نفس یعنی روح ہے:

﴿أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَحْسَرُنِي عَلَى مَا كَرِهْتُ فِي حَتِّبِ اللَّهِ﴾ (٣٩/الزمر: ٥٦)

”تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے، کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔“

﴿وَلَتَنْتَظِرَنَّ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ (٥٩/الحشر: ١٨)

”اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا۔“

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ﴾ (٨١/التكوير: ١٤)

”اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔“

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ﴾ (٨٢/الانفطار: ١٥)

”اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔“

﴿فَلَا تُظَلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ (٢١/الانبیاء: ٢٧)

”تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔“

جنت کی نسبت ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (السجدة: ۱۷)

”کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے؟“  
ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں، بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

﴿قَادُ خُلِيٍّ فِي عَيْدِي ۖ وَادُخُلِيٍّ جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۹، ۳۰)

”اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلہ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔ لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ نہ چھپا ہو تو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے اور بیماریوں میں وہ سوکھ کر کاٹا ہو گیا پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں جھرتے اور گھٹتے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل مانتھل بن کر ان کی جگہ لیتی رہی پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے۔ اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جاسکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کیا تھا وہ جس طرح کل تھی بعینہ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بعینہ وہی اس کو پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا

کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا۔ جسم کے اجزا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، گھراس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاسی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ خدا نے فرمایا:

﴿وَجُودًا يُؤْمِنُ ۖ مُسْفِرًا ۖ صَاحِبَةً مُسْتَبْرَحًا ۖ وَوَجُودًا يُؤْمِنُ عَلَيْهَا غَبَرًا ۖ تَرَاهَا

قَتْرًا ۗ﴾ (۸۰ / عبس: ۳۸-۴۱)

”کتنے چہرے اس دن روشن ہستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔“

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَ الْكٰفِرِثَّمْ بَعْدَ اٰيٰتِنَا كُمْ

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ يٰۤاَكْفَرْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِينَ اَبْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَاِنَّهُمْ فِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ

فِيهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (۳ / آل عمران: ۱۰۶، ۱۰۷)

”جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم

وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو اور لیکن

جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔“

صحیح حدیثوں میں ہے کہ ”جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھا پانہیں

آئے گا، ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، \* دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ

کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے

بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر ان کے جسم صحیح و سالم نمودار

ہوں گے پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی۔“ یہ بھی آیا ہے کہ ”جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں

اٹھیں گے۔“ ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق

نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

\* جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ماجاء فی صفة ثياب اهل الجنة: ۲۵۳۹ و باب ماجاء فی سن اهل

الجنة: ۲۵۴۵؛ دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة و نعیمها: ۲۸۲۸؛ مسند أحمد، ج ۲، ص: ۲۹۵، ۳۴۲۔

## جزا اور سزا

”یومِ آخر“ یا ”یومِ دین“ پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے اور دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھایا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کا اچھایا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگنتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو ”یم لوک“ میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگنتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل قرار نہ پائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں پیدا ہو کر سزا بھگنتی ہے اور اس وقت تک اس آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس۔۔۔ اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھایا برا کوئی کام ہی صادر نہ ہو یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (مکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پر لے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا اور جنم کے آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پر لے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے، لیکن اگر اس اصولی نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم

کے دم میں خارتستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے اور بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور بائیں ہمد دائی وابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پر لے کے بعد وہی جنم اور کریم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ ❁

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسانوں کو نجات دلائی ہے، انہوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی، مختلف زردشتی فرقوں نے آریں نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ”اروالے ویران“ کے عجیب و غریب مشابہات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ ❁ صحیفہ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲-۱۹) علیٰ ہذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں۔ نیکو کاروں کے لیے ایک ”ستھری آبادی“ کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لیے ہلاکت اور بربادی اور دردناک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (پیدائش ۲۵-۱۸) اور یعقوب علیہ السلام (پیدائش ۲۹-۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ”جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶-۲۳) کا بھی تذکرہ ہے اور جنم کی آگ (استثناء ۳۲-۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷-۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۲-۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۲-۱۳) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثال سلیمانی میں ہے کہ ”انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا، وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا

❁ تناخ کے رو میں اللہ وہی، جن ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون ہے۔ ❁ دیستان مذاہب کا مصنف جوزدشتی مذاہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

پھرے گا (۵-۲۱) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں جاگ اٹھیں گے، بعضے حیات ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے (۱۲-۲) حزقیال (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں ”صدوقی“ نام ایک فرقہ پیدا ہوا، جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں \* \* \* \* \* مجملہ ان کے وہ قیامت اور حیات اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور قیامت، حیات اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی۔ (مرقس ۱۲-۲۳) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گناہگار ہوں گے مگر چند روز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (۲/بقرہ: ۸۰، ۳/عمران: ۲۳) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز \* \* \* \* \* یا گیارہ مہینے ہیں۔ \* \* \* \* \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آ کر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا جواب دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افسردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں: ”میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کارس پھرنہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیانہ ہوں۔“ (متی ۲۶-۲۹، ۳۹) \* \* \* \* \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودی علما کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

”اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔“ (متی ۲۳-۳۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

”اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزز کو اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ

\* \* \* \* \* برٹش انسائیکلو پیڈیا مضمون صدوقین (صدوقیز)۔ \* \* \* \* \* کتب تفسیر میں ان آجوں کی تفسیر دیکھو۔

\* \* \* \* \* تیل کا ترجمہ قرآن مجید حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸۔

\* \* \* \* \* اس کے اور آگے کے حوالوں کے لیے دیکھیے: الکتاب المقدس، کتاب العہد النجدید۔



ابراہام! مجھ پر رحم کرو اور لرز کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سراپانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔“ (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو ”آگ اور گندھک“ کہا گیا ہے۔ (۱۳-۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں۔ (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائے و جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشرہ کا بیان متی میں ہے۔ (متی ۲۶-۱۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے۔ (لوقا ۱۶-۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

”مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔“ (رومیوں ۲-۸۰)

”سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔“ (رومیوں ۱۳-۱۱)

”لیکن دے اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گیا۔“ (اول پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا، بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیے گزشتہ مذاہب کے تشدہ بیانات پر سیر حاصل بخشیں کیں اور ان کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس طرح بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

### عالم آخرت کا فہم و ادراک

اس عالم آخر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ وزیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص و لوازم مستلزم ہو گئے ہیں باہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بیخبر نہ رہیں چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض امور کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعض ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وحی محمدی ﷺ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالم آخرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان

مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی مہووم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقولوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر تماشا شیوں اور دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف الخیال مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی ﷺ نے ایسے نچے تھے الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقتوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی، تاکہ وہ سب کے لیے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا میں تمام تر مادی ماحول، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات ہر چار طرف سے لپٹے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سر تا پا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے ہم جب ”آگ“ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کو اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گناہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ، اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے۔ ”وزن“ کا لفظ سننے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں آ جاتی ہیں ترازو، پائسنگ، پلے ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا۔ اسی طرح نامہ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں گے تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی اس بنا پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے، کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے ہاں ہمدان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں اگر مردِ اولیٰ ہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقولوں کے اس اختلاف مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا، تاکہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لیے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن

کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہیں وہ محض عادی ہیں یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کار فرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کار فرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل رہے، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں وحی محمدی ﷺ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

﴿يَوْمَ نَبْدَلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ﴾ (١٤ / ابراہیم: ٤٨)

”جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)۔“

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری تھے اس بنا پر جسمانی و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔ اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وهو الہادی الی الصواب۔

### اصول جزا

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہل فلسفہ قانون قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازہ الہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں، حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصول حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے پھر جس طرح دوا اصول حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ بھی وہ شفا یاب ہوتا ہے۔

## اعمال کے لوازم و نتائج

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور غم، شجاعت اور ہزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سکھیا سے سَمَنَتْ، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعتی اشیاء میں ہے۔ اشخاص کی نیکو کاری و بد کاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فریکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام ”شریعت“ ہے، انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کے متعلق وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ ہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول، عمل اور ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آ جاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

﴿أَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (٤٥ / الجاثیہ: ٢٨)

”جو تم کرتے تھے، آج وہی بدلہ پاؤ گے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزاوسز اہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے۔ ایک اور جگہ ہے:

﴿يُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَى ۝﴾ (۲۰ / طہ: ۱۵)

”تاکہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے، جو وہ کرتی تھی۔“

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزاوسز اتمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں:

﴿فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا يَهِيمُونَ ۝﴾

(۱۶ / النحل: ۳۴)

”تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔“

غرض جزاوسز انہیں اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ ”قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔“

### حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دونوں ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئندہ ہو مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ ”نقد را بہ نسیہ مگزار“، لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جو حکم میں ڈالتے ہیں، تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجراور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں، تاکہ دولت فردا سے وہ بہرہ مند ہوں ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے، تاکہ اس کی آئندہ کی زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایہ عزیز کو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لاسکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف

صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۲ وادب المفرد وبخاری، باب الظلم

ظلمات: ۴۹۵۔

سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کر دیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائنداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں، اسی لیے ایمان کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں۔ جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے گناہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۖ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ﴾ (٥٧ / القیامۃ: ٢٠، ٢١)

”ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔“

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو۔ ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کر دو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

﴿وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَخَيْرًا﴾ (٧٦ / الدهر: ١٢)

”اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے اور مزدوری دی۔“

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی، تاکہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

((حُقِّبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُقِّبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ)) ❁

”یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔“

نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے ہیں اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس لیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاناہل لذتوں سے شاد کام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

❁ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ماجاء حفت الجنة بالمكاره: ٢٥٥٩۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۗ﴾

(۷۹/النازعات: ۴۰، ۴۱)

”لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔“

نامہ عمل

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بلا حکم خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوام و وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہوا ہے۔ قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْنَ كُلَّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۗ﴾ (۱۰/یونس: ۳۰)

”اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمائے گی۔“

﴿كُلُّ أَمْرٍ بِيْنَا كَسْبٍ رَّهِيْنٌ ۗ﴾ (۵۲/الطور: ۲۱)

”ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔“

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِيْنَا كَسْبٍ رَّهِيْنَةٌ ۗ﴾ (۷۴/المذثر: ۳۸)

”ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔“

﴿مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۗ﴾

(۹۹/الزلزال: ۷، ۸)

”تو جو کوئی ایک چوٹی بھرنیکل کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چوٹی برابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا۔“

﴿يَوْمَ نَجِدُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۗ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۗ﴾

(۳/آل عمران: ۳۰)

”جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے، ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔“

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی تنہائی میں بولا جائے، خدائی شہاد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

﴿ اِذْ يَتَلَفَّى الصَّالِقِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۗ مَا يَلْفُظُونَ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۗ ﴾ (۵۰/ق: ۱۷، ۱۸)

”جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔“

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

﴿ اَمْرٌ يُحْشَوْنَ اَنْ اَكَلَتْ سَمْعُهُمْ وَجُوهُهُمْ طَبْلًا وَّرُسُلَنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ۗ ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۸۰)

”کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کان پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال لکھتے ہیں۔“

﴿ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَكْفُرُونَ ۗ ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۱)

”بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔“

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

﴿ وَمَا تَكْفُرُونَ فِي شَيْءٍ وَّمَا تَكْفُرُونَ مِنْ قُرْآنٍ وَّلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا اِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ ﴾ (۱۰/ یونس: ۶۱)

”اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں، جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔“

کبھی یہ کہا کہ ہر انسان کا نامہ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔ فرمایا:

﴿ وَكُلُّ الْاِنْسَانِ اِلٰذْمِنُهُ ظَالِمٌ وَّخَرَجَ لَهُ وَاخْرَجَ لَكَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مِنْهُ وَاۡقْرَا ۗ ﴾

﴿ كِتَابِكَ ط كُفِّي بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۗ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴)

”اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، اپنا دفتر پڑھ لے آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہوتا کافی ہے۔“

اس آیت کا ایسا مجمل ہے کہ نامہ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا



ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

﴿وَوَضِعَ الْكِتَابَ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يُؤْتِنَا مَا لَ هَذَا الْكِتَابُ لَا يَغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (١٨ / الكهف: ٤٩)

”اور نامہ اعمال رکھا جائے گا تو، تو دیکھے گا گناہگاروں کو، اس میں جو لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔“

بائیں ہمہ اگر کوئی ٹھیک لفظوں کا پابند ہو کر نامہ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

### اعضا کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا بُرا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۖ وَلَوْ أَلْفَىٰ مَعَادِيرَ كَا۟ثِرَةً﴾ (٧٥ / القيامة: ١٤، ١٥)

”بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔“

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ عَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (٨٣ / المطففين: ١٤)

”نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔“

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ”جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئینہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔“

ترمدی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة ويل للمطففين: ٣٣٤۔

اسی طرح سے وہ اپنے اعضا سے جو برابر کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑو، اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے:

﴿يَعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بَسْمِهِمْ﴾ (۵۵/ الرحمن: ۴۱)

”گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔“

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفس انسانی کے اعمال بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے، فرمایا:

﴿وَأَمَّا زُورُ الْيَوْمِ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۱﴾ أَلَمْ أَعْهَدَ إِلَيْكُمْ لَيْلَىٰ آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۲﴾ وَإِنْ أَعْبُدُونِي ۚ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۳﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿۴﴾ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۵﴾ إِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۶﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَنَشْهَدُ أَرْجُلَهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۷﴾﴾ (۳۶/ يس: ۵۹-۶۵)

”اے گناہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ..... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔“

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿۱﴾ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ ۖ وَأَبْصَارُهُمْ ۖ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲﴾ وَقَالُوا لَوْلَا دُعِينَا لَهُم لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۚ قَالَ نَاوَا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۖ﴾ (۴۱/ ختم السجدة: ۱۹-۲۱)

”اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ باٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔“

اس لیے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکر

اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل، انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا۔ یہ کہ انسان کو اس۔ عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

﴿جَزَاءٌ مِّمَّا كَفَرْتُمْ﴾ (النبا: ۲۶) ”پورا پورا بدلہ۔“

اس برابری اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا

کیا، فرمایا:

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۝ كَمَنْ تَقَلَّتْ مُوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مُوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ﴾

(۷/ الاعراف: ۹-۷)

”پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔“

﴿فَأَمَّا مَنْ تَقَلَّتْ مُوَازِينُهُ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مُوَازِينُهُ ۝ فَأُمَةٌ هَٰوِيَةٌ ۝﴾

(۱۰۱/ القارعة: ۶-۹)

”تو جس کی تول بھاری ہوئی، تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہوگی۔“

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے۔ پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح کم و بیش نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

﴿أَلَمْ يَأْتِ الْبُرْجُ بِالْحَقِّ وَالْبَيْزَانَ ۝﴾ (الشوری: ۱۷)

”وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔“

یعنی کتاب الہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے،

(طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

﴿وَوَضَعَ الْمِيزَانَ﴾ (۵۵/ الرحمن: ۷) ”اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔“

حساب

کئی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورہ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ حَرْدَلٍ آتَيْنَاهَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حُسْبِينَ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۴۷)

”اور ہم قیامت کے دن کے لیے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں، حساب کرنے والے۔“

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہر حال وزن و حساب کے ماویٰ ہی مفہوموں کو اگر صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت و دوزخ

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الہی کی تعمیل کرے، تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی ملتی ہیں، بہشت ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کیسوں کی تلافی اور گزشتہ حیات فانی کے اعمال بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی دوزخ ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو توراہ اور قرآن پاک میں مذکور ہے، وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں، بلکہ وہ حقیقت انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو

اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خالقیت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۗ﴾ (البقرة: ۳۰)

”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دُوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکو کاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ تَّبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۗ﴾

(البقرة: ۳۸، ۳۹)

”ہم نے کہا، تم سب اس جنت سے اتر دو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں رہا کریں گے۔“

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى ۗ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَعْيُنُ ۗ﴾ (طہ: ۱۲۳، ۱۲۴)

”خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بد بخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کے لیے تنگ معاش ہوگی اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔“

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، توراہ کی رو سے آدم علیہ السلام کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے

اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے، تو ان سے کہا گیا (سفر تکوین - ۲)

”اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کنارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔“

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں، لیکن ایک آیت سے اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ”یہ حیات جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے۔“ مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ”برہنگی کا علم“ ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

﴿قَوَّسُوْا۟ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هٰذَا هُوَ الَّذِيۥٓ اٰذٰنَكَ عَلٰۤى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٌ لَّا يَبْلٰى ۗ فَاتَّخَذَا مِنْهَا مَبْدِئًا لِّهَمَّآ سَوَآءٍۭهُمَا﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰، ۱۲۱)

”شیطان نے آدم کو دوسرا دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھلایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔“

اب سوال یہ ہے کہ ”حیات جاوداں“ اور ”غیر فانی بادشاہی“ سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے درد سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے بھی گرا نبار نہیں ہے، غرض اس شیر و شرکی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا:

﴿وَلَقَدْۢ اٰتٰنَا سُوۡرٰتَہٗاۙ فَآلَہُمَّآ فُجُوۡرَہَاۙ وَتَقْوٰیہَاۙ﴾ (۹۱ / الشمس: ۸، ۷)

”اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر نفس میں اس کی بدی اور نیکی کو الہام کیا۔“

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاٰمَانَۙ عَلٰۤى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِۙ فَابْتٰنَۙ اَنْ یَّحْمِلْنَہَاۙ وَاَشْفَقْنَ مِنْہَاۙ﴾

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۗ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ  
وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٧٣﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

”ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں، شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھالیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سبب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اتنا بڑا ہی ہے کہ گناہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الہی جو انسان کی پیدائش سے تھی اس صورت سے پوری ہوئی اور وہ حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضاے الہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جیسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض و اتفاق سے و لوادینا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیر الہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی و جدوجہد اور اس کے مطابق سعی و عمل کے ذریعہ سے مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِنَّمَا أَتَيْنَاكُمْ مَبِئْتَىٰ هُدًىٰ مِّنْ نَّبَعِ هَدَايَٰ فَلَآ خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٠﴾﴾ (البقرة: ۳۸)

”یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔“

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِنَّمَا أَتَيْنَاكُمْ مَبِئْتَىٰ هُدًىٰ ۖ فَمَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْغَىٰ ﴿٢٠﴾﴾ (طہ: ۱۲۳)

”تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ

بد بخت۔“

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے ذریعہ اسی حیات باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو مزدومعاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ تھی:

﴿فَلَا تَجْرِبَنَّكَ مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَى ۗ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۗ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَىٰ ۗ﴾ (٢٠ / طہ: ١١٧، ١١٩)

”تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کر دے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا، نہ تنگ، نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔“

آدم علیہ السلام اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی اور تنگ بھی ہوئے پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آ کر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا دھوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا اور انہیں کے تیار کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر دیا اور اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصولی معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے، تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے، عرفان الہی (عقائد صحیحہ) اور عبادت و اطاعت الہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۗ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۗ﴾

(٢٣ / المؤمنون: ١٠، ١١)

”یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی۔ چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

﴿وَفِيهَا مَا كَتَمْتُمُوهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۗ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۗ وَبِلَاكِ الْجَنَّةِ الْاَنْفِ اُورِثْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ﴾ (٤٣ / الزخرف: ٧١، ٧٢)



”اور اس (جنت) میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔“

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا:

﴿وَنُودُوا أَنْ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾ (۷/ الاعراف: ۴۳)

”اور ان کو پکار کر کہے گا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔“

ملت توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

﴿وَاَجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝﴾ (۲۶/ الشعراء: ۸۵)

”اور مجھے باغِ نعمت کے وارثوں میں کر۔“

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ”تقویٰ“ ہے۔

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝﴾ (۱۹/ مريم: ۶۳)

”یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے، جو تقویٰ والا ہوگا۔“

انسانی جزاوسزاکے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزاوسزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا ہے، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزاوسزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے جو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزاوسزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنائے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لیے پیدا کیا



”خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔“

یہ بھی انہیں سے وعدہ ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ (النور: ۵۵)

”خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے انگوں کو حاکم بنایا تھا۔“

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسن عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَكَذَٰلِكَ الْآخِرَةُ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾ (النحل: ۳۰)

”جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔“

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی، فرمایا:

﴿خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (الحج: ۱۱)

”اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔“

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خَيْرٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (البقرة: ۱۱۴)

”ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔“

﴿حَوَّطْتُ أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (البقرة: ۲۱۷)

”ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔“

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا:

﴿فَأَعَدُّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (آل عمران: ۵۶)

”تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔“

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَمَعَشْرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْلَى﴾

(۲۰/ طہ: ۱۲۴)

”اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گزران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔“

انتہایہ ہے خود صحابہ کو جنگ احد میں جو فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگزاشتوں کا ثمرہ بتایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَفْعِ الْجَمْعِ إِنَّهُمْ اسْتَزَلَّوْهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا﴾

(۳/ آل عمران: ۱۵۵)

”تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں جو پیچھے بنے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔“

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ﴾

(۴۲/ الشوری: ۳۰)

”جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے ورگزر کرتا ہے۔“

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَلْيَسًا لَّيْسُوا فِيهَا كَاذِبُونَ إِلَّا يَجْعَلُونَ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ ۚ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۱۲)

”ان پر ذلت ماری گئی، جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت حاصل ہے)، وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کمالائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدود الہی سے آگے بڑھتے ہیں۔“

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْبَةَ وَالْإِحْسَانَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكْفُرُوا مِنْ فُوقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾

(۵/ المائدہ: ۶۶)

”اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکات آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے

(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔“

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَأَتَقُوا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

(۷/ الاعراف: ۹۶)

”اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کو کھولنے لیتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔“

مگر یہ دارالجزء فانی ہے

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے، جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گوانسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزء جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منجہا نہیں بنانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو نہ بھول جانا چاہیے، اس مسافر کی عقل سلیم کی داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدابہار وطن کو فراموش کر بیٹھے:

﴿بَلْ تُؤْتُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ حَبِيرًا وَانْقٰسًا﴾ (۸۷/ الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷)

”بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پاکدار ہے۔“

﴿وَلَا جُرْأَلِیٰۤا لِّلْآخِرَةِ حَبِیْرًا﴾ (۱۲/ یوسف: ۵۷)

”اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔“

اور اسی طرح گناہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے:

﴿فَاَذَقَهُمُ اللّٰهُ الْعِزَّیۡ فِی الْحَبِیۡوةِ الدُّنْیَا ۗ وَكَذٰلِكَ ابۡرَءُ الْآخِرَةَ لَکُمۡ اَکْبَرُ ۗ لَوْ کَانَوۡا یَعْلَمُوۡنَ﴾

(۳۹/ الزمر: ۲۶)

”تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب

اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے۔“

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہمہ لی جائے مگر دہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہمہ سکتا ہے کہ  
﴿وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْغَىٰ﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٧)

”آخرت کا عذاب بہت زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔“

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جو زور و قوت، جاہ و جلال، نعمت و مال اور حکومت و سروری ملے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور دہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائیداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿وَاتَّبِعْ فِيهَا أَنكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ ط﴾ (٢٨ / القصص: ٧٧)

”اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔“

چنانچہ ناطق خلیفہ یہود پر بتا ہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جاہ و کبریا کی محبت میں ایسے پھنس کر ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سود کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِثْلَهُ يَأْخُذُوهُ ط أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ بِبِئَاتٍ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ط وَالذَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّذِينَ يُتَّقُونَ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

(٧ / الاعراف: ١٦٩)

”تو ان کے بعد کچھ ناطق خلیفہ کتاب کے وارث ہوئے، جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر لیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا، کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔“

یہ دارالجزاء اور دارالاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا دائمی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی

گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدابہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنہیلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کیے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزاؤں، تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے۔

① نیکی سے برائی کا کفارہ: چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فردوہل جاتی ہے اسی کا نام کفارہ عمل ہے، چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

﴿ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾ (۱۱/۱۱) (ہود: ۱۱۴)

”بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔“

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکو کار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوا كُفْرًا مَّا تُنْفِقُونَ عَنْهُ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُنْزِلُ عَلَيْكُمْ مَدْرًا خَلًا كَرِيمًا ﴾

(۴/النساء: ۳۱)

”تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم

تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔“

﴿ لَیْنِ اَقْبَتُمْ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِنَا وَعَزَرْتُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّا نُكْفِرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاَلَا نَخْلُقُكُمْ جُنُودًا مُّجْرِمًا مِّنْ تَحْتِهَا الْاَرْضُ ﴾

(۵/المائدة: ۱۲)

”البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے، تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں

داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّاتِ﴾

(۱۶/ الاحقاف: ۱۶)

”یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو (اور) جنتیوں کے (شمول) میں ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے اور یہی ہیں رہنے والے جنت کے۔“

② توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکو کاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کر لے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گناہگار سے گناہگار انسان کو بھی خدا کے آغوشِ محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور اور پھران کی توبہ اور رحمت الہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گناہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وارہتی ہے، رحمت الہی کے اس پر جوشِ نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہر مت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سرلی آواز مدہم اور انجیل کی خوش خبری مبہم ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ العالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا﴾

(۱۹/ مریم: ۶۰)

”مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے، تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔“

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ

عَفُورًا رَحِيمًا﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷۰)

”مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان



کو بھی بشارت ہے:

﴿فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ (۵/ المائدة: ۳۹، ۴۰)

”تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا، تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

﴿وَالَّذِينَ لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى ۝﴾ (۲۰/ طہ: ۸۲)

”اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا۔“

لیکن یہ توبہ کس لیے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْءَ يُجَاهِلُهَا تُمْرٌ يُتَوَّنُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ط وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ؕ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ إِلَهُنَّ وَالَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارًا ط﴾

(۴/ النساء: ۱۷، ۱۸)

”اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں، توبہ کی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔“

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمت الہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

﴿وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا عَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾

(۷/ الاعراف: ۱۵۳)

”اور جنہوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا، تو بے شک

تیرا پروردگار اس کے بعد اس کو بخشے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔“  
 ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾

(۴/ النساء: ۱۱۰)

”اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے، تو وہ اللہ کو بخشش والا رحم کرنے والا پائے گا۔“

③ مصائب کی تشبیہ اور کفارہ: دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تشبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہو کر آدہ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انہیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوک کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سر مستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت کا میاں بی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعۃً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگ دستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی، ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوک کر ہے جس کو کھلا کر سر مست سے سر مست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستے کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جو روحانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو، اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و صلاح کی فکر کریں، فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقَصْنَا مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۳۰)

”اور بے شک ہم نے فرعون، والوں کو قحطوں اور بھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔“

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

﴿وَكُونْتُمْ بِالْحَمْدِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّكُمْ تَذَرُّوْنَ ۝﴾ (۷/ الاعراف: ۱۶۸)

”اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزماتا، تاکہ وہ شاید باز آئیں۔“

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن لَّوِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ۝﴾

(۷/ الاعراف: ۹۴)

”اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں

میں گرفتار کیا، تاکہ شاید وہ گزر گزراں آئیں۔“

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

﴿وَلَنبَلِّغَنَّكُمْ أَشْيَاءَ مِّنَ الْخُوفِ وَالْجُوعِ وَنَقِصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّرَّاتِ ۖ وَبَشِيرِ

الطَّيْرِينِ ۗ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۗ وَأُولَٰئِكَ

عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝﴾

(۲/ البقرة: ۱۰۵-۱۰۷)

”اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھولوں کی کمی سے

آزماتیں گے اور ان صابروں کو خوش خبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت سنا تی ہے تو کہتے ہیں

ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں

اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔“

اسی اصول کے تحت میں احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوْعًا أُجِزْ بِهِ﴾ (۴/ النساء: ۱۲۳)

”جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔“ تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا

فرمایا کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے

اس کو بخارا آ جائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور

اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف

ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا۔“ ﴿دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان کو کوئی

مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے

﴿یادوں کی ہم سنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً: ترمذی، ابواب التفسیر ومن سورة النساء: ۳۰۳۸، سنن ابی داؤد،

کتاب الجنائز، باب عیادة النساء: ۳۰۹۳، ابن کثیر، ۲/ ۳۸۲۔

کوئی کا ناچھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے۔“ تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کا ناچھ جائے تو وہ بھی۔“ چوتھی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کا ناچھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔“ پانچویں روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہو اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف بنانے والی ہے۔“

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پاسکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَنَذِقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَذَىٰ ذُوقَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾﴾

(۲۲/ السجدة: ۲۱)

”اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں، تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔“

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿٥٠﴾﴾

(۴/ النساء: ۱۴۷)

”اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔“

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گزشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالم بعثت میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال

صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارة المرض: ۵۶۴۰۔

صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارة المرض: ۵۶۴۱، ۵۶۴۲۔

صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب شدہ المرض: ۵۶۴۷۔

صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیة والارادة: ۷۴۶۸۔

نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گزشتہ بد اعمالیوں کی سزا بھگت کران کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک و صاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی عالم برزخ میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک و صاف بنا پڑے گا، یہی عالم برزخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برواشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تا کہ حیات ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک و صاف ہو سکیں تو پاک و صاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمال نیک، توبہ اور مصائب میں صبر و شکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پاسکے۔

یہ بات کہ عذاب برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے اور یہ اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایہ نکلتی ہے۔

گناہگار حشر کے دن کہیں گے:

﴿وَلَكُنَّا أَجَلًا لَنَا﴾ (۱۶/ الانعام: ۱۲۹)

”اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے۔“

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمر ((ان طول مقام امتی فی قبورهم تمحیض لذنوبهم)) ❁

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول

قیام ان کو گناہوں سے خالص کرنا ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

((الضمة فی قبر کفارة لکل مومن لکل ذنب بقی علیہ ولم یغفر له)) ❁

❁ کنز العمال، باب عذاب القبر، ج ۸، ص: ۹۶۔ ❁ ایضاً۔

”یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے۔“

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

((اكثر عذاب امتی فی قبورهم)) ❁

”میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔“

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکل کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فان وقت بالخللاص منها فی هذه الدار والافنى البرزخ فان وفى بالخللاص

والافنى موقف القيامة واهوالها ما يخلصهم من تلك البقية. ❁

”اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا

سے اس کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور

اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔“

روایئے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گزر چکی ہے، وہ منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گناہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا يَعْشَرَ الْآخِرِينَ قَدْ اسْتَلْزَمْتُمْ مِنَ الْاٰلِئِنِّ وَقَالَ اَوْلِيَؤُهُمْ مِنَ

الْاٰلِئِنِّ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَكَلْنَا اَجَلَنَا الَّذِىْ اٰجَلْتْ لَنَا﴾

(۶/ الانعام: ۱۲۹)

”اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے گروہ جن، تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنالیا

اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام

نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا پہنچ چکے۔“

یہ الفاظ کہ ”ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے“ یہ معنی رکھتے ہیں کہ

عالم برزخ کا مقررہ دورہ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے

بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے۔ جواب ملے گا:

❁ اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البائد، باب الوقائع الحشریہ، ج ۱۲، ص ۲۹ میں نقل کیا ہے، لیکن ہمیں اس

کا اصل ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔

❁ شفاء العلیل لابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر، ص: ۲۲۴۔

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خُلْدًا إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ ﴾

(۱۲۹/ الانعام: ۱۲۹)

”فرمائے گا آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا، اس میں سدا رہو گے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے، بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔“

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورہ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے اس کے علم و حکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات ملے گی۔ ﴿﴾

عذاب دوزخ کفارہ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے کہ

﴿ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَدَايِكُمْ إِنَّ شُكْرَكُمْ وَأَمْنُكُمْ ۝ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝ ﴾

(۱۴۷/ النساء: ۱۴۷)

”خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تمہاری شکرگزاری کو قبول کرنے والا (اور تمہارے دلوں کے حال کو) جاننے والا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ گناہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گناہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں۔ جس وقت آدم علیہ السلام کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

﴿ اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۝ فَمَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْ بَنِي هُدَىٰ فَمَنْ تَبِعَ هَدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۝ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرة: ۳۸، ۳۹)

”یہاں سے تم سب اترو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ناشکر کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔“

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذاب دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں

﴿﴾ حسب تفسیر ابن عباس؛ ابن جریر طبری، ج ۸، ص: ۲۴ مصر۔

اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا غیظ و غضب کے اظہار کے لیے نہیں۔ فرمایا:

﴿ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَكْفَنَ وَنَهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۗ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۙ ﴾ (۳۳ / الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

”ہم نے یہ امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔“

اس آیت پاک سے ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفت ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے وہ اپنے کو رحمت الہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

﴿ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ﴾ (۹ / التوبة: ۷۰)

”اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔“

﴿ وَمَا اللَّهُ بِرَبِّدٍ ظَلَمًا لِلْعِبَادِ ۝ ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۳۱)

”اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔“

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

﴿ لِلْجَنَّةِ كُلُّ كَفَّيْنٍ يَمَّا تَسْعَى ۝ ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۵)

”کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔“

اس لیے، بہت ہو یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً: کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا نتیجہ سیرابی، بھوک کا نتیجہ تکلیف، بیماری کا نتیجہ بے آرامی، گرنے کا نتیجہ چوٹ، زہر کا نتیجہ موت، شہد کا نتیجہ مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی



جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک اور روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں یکساں ہمارے اعمال کے لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرمادیا تھا، ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشنا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

﴿رَسُولًا مَّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۗ﴾

(۴/النساء: ۱۶۵)

”یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے، تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔“

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝﴾ (۲۱/الانبیاء: ۱۰۷)

”ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔“

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کیا اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بد اعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلِهَا مُصْرَعُونَ ۗ وَكَوْشَاءُ رَبِّكَ لِيَجْعَلَ النَّاسَ

أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ مُمْتَلِفِينَ ۗ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۗ وَلِذَلِكَ خَلَقْتُهُمْ ۗ﴾

(۱۱/ہود: ۱۱۷-۱۱۹)

”اور نہ تھا تیرا رب جو آ باد یوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا اور در آنحالیکہ ان کے رہنے والے نیکو کار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہو اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا تھا۔“

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کی خاطر بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں، لیکن وہ

خود انسان ہے جو اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا اپنے کو سزاوار ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ. ❁

”خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا، عذاب کے لیے نہیں۔“

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے درپے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمن و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

﴿ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۗ ﴾ (۱۲/ الانعام: ۱۲)

”اس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا۔“

﴿ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۗ ﴾ (۶/ الانعام: ۵۴)

”تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔“

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۗ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۶)

”اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے۔“

﴿ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۗ ﴾ (۱۸/ الکہف: ۵۸)

”اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔“

﴿ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي ۗ ﴾ ❁

”اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔“

وہ اپنے گناہ گار و سیرکار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا، حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

﴿ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۗ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۳۴) ”اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔“

اور تسلی دی ہے:

﴿ يُعَاذُ بِالَّذِينَ اسْتَرْفَعُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ

جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۗ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۵۳)

”اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو،

خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بے شک وہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔“

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا اور وہاں اس کی رحمت کا سب

❁ طبری، ج ۱۲، ص ۸۱- مصر۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالى: ولقد سبق كلمتنا..... ۷۴۵۳۔

سے بڑا مظہر اس کے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقام رحمت (بہشت) سے قرب ہے، فرمایا:

﴿مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۗ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝﴾ (۶/ الانعام: ۱۶)

”جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا تو وہ وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ

حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ گناہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل

کے بھگت لینے کے بعد بالآخر اپنی رحمت کے سایہ میں لے اور ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ

فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ

ان غلط کاریوں کے جو نتائج بد انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے جسم انسانی

جدوجہد کرتا ہے اور اس کی اس لڑائی کا نام بیماری ہے اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے،

جن کو ہم درد، درد شکم، اعضا شکنی، بے خوابی وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریوں کا حال

ہے جن کو ہم اصطلاح شرعی میں ”گناہ“ کہتے ہیں اور جن کے نتائج بد کو عذاب کہتے ہیں اور یہ نتائج جو آتش

دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں

کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگی اور جو نئی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے

سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موردی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ

بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے، بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں درد، اعضا شکنی،

شدت تشنگی، سوزش جسم، ان کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بد مزہ سے بد مزہ کھانا کھلایا جاتا ہے،

ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی

تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس

کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے نتائج بد سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں

اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں، بلکہ خود اس

بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں بہتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث صحیحہ سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذاب دوزخ

سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

﴿وَالصَّحَّاحُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذُ الْكُفْرَيْنَ ﴿٣﴾﴾ (آل عمران: ١٤١)

”اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔“

یہی اصول عذابِ اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گناہگار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوقِ عباد کے بعد: ((حَتَّىٰ إِذَا هُذِّبُوا وَنُقُوا إِذِنَ لَهُمْ فِي دُخُولِ الْجَنَّةِ)) ﴿٣﴾ ”یہاں تک کہ جب گناہگار چھٹ جائیں گے اور پاک و صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔“

اس حدیث میں یہ دو لفظ ((هُذِّبُوا وَنُقُوا)) ذرا تشریح طلب ہے۔ ((هُذِّبُوا)) کا مصدر تہذیب ہے، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں، تاکہ درخت میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو کر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور ((نُقُوا)) کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے، تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گناہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

﴿طِبِّئْتُمْ فَأَدْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴿٧٣﴾﴾ (الزمر: ٧٣)

”تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے آ جاؤ۔“

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گناہگاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لیے ہر گناہ گار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

﴿لِيُؤْتِيَنَّهُمْ فِيهَا أَحْقَابًا ﴿٧٨﴾﴾ (النبا: ٧٨)

”دوزخ میں وہ صد ہا سال تک پڑے رہیں گے۔“

لیکن بالآخر ان صد ہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث روایائے برزخ میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا، جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے، پھر نکل آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے۔“ ﴿٣﴾ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گناہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

صحیح بخاری - کتاب الرقاق ، باب القصاص يوم القيامة: ٦٥٣٥۔

صحیح بخاری ، کتاب التعبير ، باب تعبير الرؤيا بعد الصبح: ٧٠٤٧۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گناہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفا خانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گناہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اس رحمن و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بد بختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بد اعمالیوں کے میل پچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالا خراپی آ بانی اور فطری وراثت (جنت) پائیں اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَمْتَصِرْنَ ۗ فَيَأْتِي الْآءَ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۗ فَاِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۗ فَيَأْتِي الْآءَ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۗ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ۗ فَيَأْتِي الْآءَ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۗ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالْأُصْحَابِ الْأَقْدَامِ ۗ فَيَأْتِي الْآءَ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۗ هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ۗ يَطْفَوْنَ فِيهَا وَبَيْنَ أَعْيُنِهِمْ الْحَبُوبُ الَّتِي لَا يَأْكُلُونَ ۗ فَيَأْتِي الْآءَ رَبَّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۗ﴾

(۵۵/ الرحمن: ۳۵-۴۵)

”تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، گناہگار اپنی نشانوں سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے یہ وہ دوزخ ہے جس کو گناہ گار جھٹلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے کیجئے یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہیں کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

## دوزخ میں رحمتِ الہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گناہگار ہو، تاہم اس کے نامہ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گوا اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا، جس میں ہر گناہگار کو اپنی گناہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس رحمن و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور ((رحمتی سبقت غضبی)) ﴿﴾ اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا اور گناہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف کر کے پاکوں کو بہشت میں داخل کی اجازت ملے گی، فرمایا:

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ﴾ (التغابن: ۹)

”اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔“

﴿وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يُتُوبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (۹/ التوبة: ۱۰۲)

”اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔“

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکل یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا:

﴿وَاَنْ فِتْنَكُمْ اِلَّا وَاِذْ هَاكَ اَنَّ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ لَنْ نَجِيَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ﴾

﴿الظالمين فيها جثثا﴾ (مریم: ۷۱، ۷۲)

”اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے، پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے، نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھسنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔“

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں:

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی لکڑیوں کے مانند نکلیں گے۔“ ﴿﴾

﴿ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۵۳۔

﴿ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۵۸۔

② حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”دوزخ سے کچھ لوگ اس کی مجلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔“ ❁

③ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ اس طرح آگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔“ ❁

④ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا تو آواز آئے گی اے محمد (ﷺ)! سراٹھا، مانگ، دیا جائے گا تو میں سراٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا، جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔“ ❁

⑤ حضرت عمر بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”محمد ﷺ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جنم والوں میں ہوگا۔“ ❁

⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔“ ❁

⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلانہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح آگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔“ ❁

⑧ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر

❁ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۵۹۔ ❁ ایضاً: ۶۵۶۰۔

❁ ایضاً: ۶۵۶۵۔ ❁ ایضاً: ۶۵۶۶۔ ❁ ایضاً: ۶۵۷۰۔ ❁ ایضاً: باب الصراط جسر جہنم: ۶۵۷۳۔

بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔ ❀

⑨ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جنیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دیر کے لیے مرجائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔“ ❀

⑩ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی۔“ ❀

⑪ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے صحیحین میں روایت ہے کہ ”خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہل ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہے گا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بزرگم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمن و رحیم دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔“ ❀

⑫ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”حکم ہوگا کہ جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا ہو اور اس کے دل میں جو برابر بھی نیکی رہی ہو اس کو دوزخ سے باہر کر دوس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا ہو اور جو ار کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اس کو دوزخ سے الگ کرو۔“ ❀

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (النساء: ۱۱۶)

”بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔“

❀ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اهل الایمان فی الأعمال: ۲۲۔ ❀ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفہ الجنة والنار: ۶۵۷۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اخر اهل النار: ۴۶۱۔ ❀ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ: وجوه يومئذ ناضرة: ۷۴۲۹۔ ❀ ترمذی، ابواب صفہ جہنم، باب ما جاء ان للنار نفسین: ۲۵۹۳، حدیث حسن صحیح، یہ روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہما سے ہے مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور اس میں صفہ یُخرجُ مجهول آیا ہے۔ دیکھیے: کتاب الایمان، باب زیادة الایمان ونقصانه: ۴۴۔ ”ض“



اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے براءت کی جاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے، جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک و کفر کی بخشائش نہیں

احکامِ الہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدہ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارح سے ہے اس کو ہم مختصر اعمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جاسکتی ہے، مگر جس کا شانہ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے ناامیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شرک کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذاب دوزخ کے بعد یا اللہ کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے، ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الہی میں ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان و علم و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے، اپنے ناقابل تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک و کفر کے گناہگاروں کے لیے شرک و کفر کے دورہ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے، اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

## کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عتابِ الہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے ﴿ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت دراز کے بعد ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ رحمتِ الہی کے پھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔“ ﴿اسی کے ساتھ یہ بھی حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ((رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ)) ﴿میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔“ اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی وابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے، یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان ورحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سوجھوں میں سے

﴿ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل اہل محل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ اس کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے، لیکن جہنم کے دو ام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا دائمی وجود ہے گناہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں چلیں گے۔ فقہاء اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجعہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہو گا وہ گناہگار بھی ہو گا تو جہنم دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہو گا اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ میں ہی رہے گا اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جن کے پر جوش حامی حافظ ابن قیم رحمہ اللہ ہیں نے بیچ کا مسلک اختیار کیا ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن تیمیہ اور ایک زیدی یعنی صالح مشعلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، العلم السامخ فی ایشار الحق علی الاماء و المشائخ (صفحہ ۱۲۲) نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب گناہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پاچکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی اور جنت کو بھائے دوام بخشا جائے گا، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حاوی الارواح میں (دونوں مطبوعہ ہیں، حاوی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے، میں قرآن اور احادیث اور آثار اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو برہن کیا ہے، (دیکھو شفاء العلیل، ص: ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴،

صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور نانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں۔“ اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آجائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب گناہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔ اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

۱۔ ﴿لِيُذِئِبْنَ فِيهَا آحْقَابًا﴾ (النبا: ۲۳)

”وہ دوزخ میں صد ہزار سال ٹھہریں گے۔“

صد ہزار سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن ان کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

۲۔ ﴿التَّائِبُ مَثُونًا خَلِيدًا فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾

(الانعام: ۱۲۹)

”دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا، اس میں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا ب۔ حکیم و علیم ہے۔“

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرک و کفری سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے، لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔ تیسری آیت میں ہے:

۳۔ ﴿خَلِيدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَاعِلٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾

(ہود: ۱۰۷)

”وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔“

دوسری اور تیسری دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو ”رب“ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضا ہے۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام عدم انتہا اور تسلسل و وجود پر تصریح استدلال کیا جاسکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت

صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ، ۶۹۷۳ تا ۶۹۷۵۔

کی بھٹکی بٹکا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں، فرمایا:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهيقٌ ۗ خَلِيدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ  
وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۗ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فِي الْجَنَّةِ  
خَلِيدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْدُوذٍ ۗ﴾  
(۱/۱: ۱۰۸-۱۰۶: ۱۰۸)

”تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور  
رینگنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب،  
بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے، تو وہ جنت میں ہوں  
گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر  
منقطع بخشش ہوگی۔“

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی  
مشیت سے استثناء فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ ”مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب  
جو چاہے کر ڈالتا ہے“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم رکھے،  
لیکن اہل جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا: ”مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔“ اس سے  
معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتهی دوام و تسلسل کے ساتھ  
ہمیشہ قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمہ سلف مثلاً: ابن زید اور شععی وغیرہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ  
نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہل دوزخ کی نسبت  
اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔ ❁

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ أُولَئِكَ هُمْ  
شَرُّ الْعَرَبِ ۗ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۗ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْعَرَبِ ۗ جَزَاءُ هُمْ عِنْدَ  
رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ﴾ (البینۃ: ۸۶-۹۸)

”بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد)  
پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ  
ہیں، ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں، جن میں نہریں بہتی ہوں گی

❁ تفسیر طبری، ج ۱۲، ص: ۶۶، ۶۷؛ درمثور سیوطی تفسیر آیات ہود، ج ۳، ص: ۳۵۰۔

وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔“

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے عدن فرمایا، جس کے معنی قیام اور بسنے کے ہیں، پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، بعد ازیں ابدًا، فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔  
اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

﴿وَيَذَلُّهُ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝  
وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَكْرَبُوا بِآبَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا وَبئس الْمَصِيرُ ۝﴾  
(۶۴ / التغابن: ۹، ۱۰)

”اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کر س گے اور وہ بری جگہ ہے۔“

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں ﴿خالدین﴾ (رہا کریں گے) اور ﴿خالدین فیہا ابدًا﴾ (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَ الْفَرُثُ بَعْدَٰ إِلَهَائِكُمْ  
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ  
فِيهَا خَالِدُونَ ۝﴾ (۳ / آل عمران: ۱۰۶، ۱۰۷)

”جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے، تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے، تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔“

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تمام ہے۔

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا، جب دوزخ کے میدان میں ہو گا عالم ہو گا اور کوئی ایک تنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ  
① طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک ایسا دن آئے گا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گی اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔“

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔“

③ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔“

④ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ”اہل دوزخ ریگستان عاج کے ذرات کے بقدر شمار بھی دوزخ میں رہیں پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔“

⑤ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صد ہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے۔“

⑥ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ صحابی یا ابو سعید خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے یہ فرمایا کہ ﴿الْأَمَّا شَاءَ رَبِّكَ﴾ کا استنا پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں ﴿خالدين فيها﴾ (سدا اس میں رہیں گے) وہاں یہ مشیت الہی کا استنا قائم ہے۔

⑦ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا، \* جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔

دفع شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً: وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خلدین فیہا ابدًا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكُفْرِينَ وَاعْتَدَ لَهُمْ سَعِيرًا ۗ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۶۴، ۶۵)

”بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

۲۔ ﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا﴾

\* حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے شفاء العليل، (ص: ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکورہ کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورہ ہود، جلد ۱۲، ص: ۶۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورہ ہود، جلد ۳، ص: ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہود ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ۱۲۳ مطبوعہ آلہ ہاد (حیدرآباد) میں جمعی روایت ہے۔

(۷۲/ الجن: ۲۳)

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔“

۳۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيُغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (۴/ النساء: ۱۶۸، ۱۶۹)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشنے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔“

ان تینوں آیتوں میں ﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔ باقی چند آیتوں میں ﴿أَبَدًا﴾ (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالد ہے، جیسے ﴿هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ وہ اس میں ”خالد“ رہیں گے۔ یا ایک جگہ ہے:

﴿وَدُؤُّوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۳۲/ السجدة: ۱۴)

”اور ”خلود“ کے عذاب کا مزہ چکھو۔“

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص بقرآن ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا ﴿خَالِدِينَ﴾ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو ﴿خَالِدِينَ﴾ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف ﴿خَالِدِينَ﴾ بھی ہے وہاں بھیگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ ﴿خَالِدِينَ﴾ کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گناہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گناہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خلدین کے ساتھ ﴿أَبَدًا﴾ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ گناہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے سامنے بھی خلدین کے ساتھ ابدا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَسَلَّلْ مَوْمِنًا مُتَعِدًّا فَمِزَازًا جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا﴾ (۴/ النساء: ۹۳) ”اور جو کوئی کسی باایمان کو

تصد اقل کر دے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ ﴿خَالِدًا﴾ (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔“  
یہی سبب ہے کہ منفر لہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں ”خلود“ سے مراد بیہوشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں بیہوشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنا بریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں ہم عام طور سے مجرم کے لیے حبس دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کات کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عنوعام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔  
دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گناہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ﴿وَإِنَّ الْعَجَّارَ لَفِي سَجْنٍ يَّصْلُوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۗ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۗ﴾

(۸۲/ الانفطار: ۱۶-۱۷)

”بے شک گناہگار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔“

(۲) ﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّعَمُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةٌ فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا هُمْ بِطَارِحِينَ مِنَ النَّارِ ۗ﴾

(۲/ البقرة: ۱۶۷)

”اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔“

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَتَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَيَفْتِنُنَّ بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْعِقَابِ مَا نَفَعُهُمْ مِنْهُمْ ۗ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۗ يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرَجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۗ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۗ﴾

(۵/ المائدة: ۳۶، ۳۷)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہو، تاکہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں، تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے



نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے قائم عذاب ہے۔“

(۴) ﴿كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۗ﴾

(۲۲/ الحج: ۲۲)

”وہ جب چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔“

(۵) ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فَتَقْنَا فَمَا لَهُمْ نَارُ ۚ كَلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝﴾

(۳۲/ السجدة: ۲۰)

”اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو، جس کو تم جھٹلاتے تھے۔“

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گناہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ خدا سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی بار ہم نیکی کے کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جاسکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گناہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پاسکتے ہیں مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گناہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جاسکتا ہے، مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام، بقا اور عدم نکالا جاسکتا ہے، مگر ایک ایک کی تصریح ہے؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔ ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گناہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور

دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا، یقیناً برائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدسیت کا دامن تمام تریاک ہے کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْعَهْدَ﴾ (۳/ آل عمران: ۹) ”تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“ ﴿إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا﴾ (۱۹/ مریم: ۶۱) ”اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا۔“ لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید، سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو یہ حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اس رحمن ورحیم اور عفو اور مغفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گناہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔“

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گناہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک و صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گناہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کہ اس سے ان کے نادم و تائب ہونے کے بجائے ان میں اور خود سری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان سے آئندہ کے نتائج بد سے نڈر پین اور بے خونی آجاتی اور ایسا ہونا تنبیہ و اصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر معافی ہوتا، اس لیے ان کی قانونی سزا تو دائمی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخر ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے بھٹکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے، جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر فارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے تو خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معاف نہیں ہو سکتے لیکن اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا ایک طرف فرمایا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ (۷۴/ المدثر: ۳۸) ”ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔“ اور دوسری طرف فرمایا: ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (۵/ المائدہ: ۴۰) ”خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔“

بحوالہ حادی الارواح ابن قیم رحمہ اللہ ص: ۲۲۲، مصر۔

یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں مگر بایں ہمہ اس حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا اور دوسری طرف خدا کی قدرت تام اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

### عذابِ طویل کا سبب

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لمحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے، اسی طرح سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صد ہا اور ہزار ہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے، چوری، عملِ خلافِ قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سا لہا سال کی قید، ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صد ہا اور ہزار ہا گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر کی جاسکتی ہے اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفا یابی کی مدت بھی ہر گناہگار کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَالِ۔

### مشرک و کافر کا آخر انجام؟

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جنم کی آگ سرد ہو جائے گی، تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے، جواب یہ ہے کہ قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا، یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا دوامِ عذاب اور خلود نار (تَحَالِدِیْنِ فِیْہَا اَبَدًا) ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسبِ مشیتِ الہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدت حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ شرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴾

(۱۲۸/ الانعام: ۱۲۸)

”فرمائے گا، دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔“

اس آیت کا آخری کلمہ خاص طور سے قابل ذکر ہے تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔ اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور پر رب کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شان ربو بیت اگر چاہے گی تو اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح الہی ہے:

﴿ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ﴾ (۵/ المائدہ: ۷۲)

”یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔“

نیز ایک اور آیت میں ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا نُفَعِّمُ لَهُمْ آيَاتِ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ

حَتَّىٰ يَكْفِيَ الْجَحِيمُ فِي سَمَوَاتِنَا ﴾ (۷/ الاعراف: ۴۰)

”بے شک جنہوں نے ہماری آجوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔“

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گوان کے لیے کبھی دوزخ کا خاتمہ بھی ہو جائے مگر پھر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گزرنہ ہو لیکن اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

﴿ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَخَّارٌ لِّسَائِرِ دُؤْدٍ ﴾ (۱۱/ ہود: ۱۰۷)

”وہ سدا دوزخ میں رہیں گے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔“

ن دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۶)

”اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے۔“

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون سا گوشہ محروم ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿قَالَ كَذَّبْتَ بَلَّغًا فَكُلُّ رَزَقِكُمْ دُورُ حِمَاٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُؤَدُّ بَأْسَهُ عَنِ الْقَوْمِ الْعَجُوبِينَ﴾

(۶/ الانعام: ۱۴۷)

”اے پیغمبر! اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گناہگاروں سے لوثایا نہیں جاسکتا۔“

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گناہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد روزِ گردے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

﴿مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ط﴾ (۶/ الانعام: ۱۶)

”جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا، تو خدا نے اس پر رحم کیا۔“

صحیح بخاری و مسلم، ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے گا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہوگا۔“ مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بہ تہدید اگر بر کشد تیغ حکم      بہ مانند کر ویاں صم و بکم

ودگردرد ہدیک صلا فنی کرم      عزا زیل گوید نصیبے برم ❁

خود اس رحمن و رحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے:

﴿يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۗ وَاللّٰهُ

الْمُصِیْرُ﴾ (۵/ المائدة: ۱۸)

”جس کو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور اسی اللہ کی آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

لیکن یہ اس کی مشیت جیسا کہ اس نے (۶/ انعام: ۱۲۸) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع حکمت و مصلحت

❁ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الرجاء مع الخوف: ۶۴۶۹؛ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ: ۶۹۷۹؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۲؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۳۴، ۴۸۴۔

❁ بوستان، ص: ۵۔

پڑنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا نے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے۔ اس لیے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿التَّائِبُ مَقُولَكُمْ خُلْدِيْنَ فِيْهَا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

(۶/ الانعام: ۱۲۸)

”دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔“

جمہور کا مسلک خلودنار

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے، اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو مشرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے، کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔ اس عقیدہ کے مطابق گناہگاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہگار تھے مگر ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ مشرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے، ان کی گناہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔ رحمت عمومی کے معتقدین گزشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کوتاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:

۱۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۙ خُلْدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۙ﴾

(۲۳/ الاحزاب: ۶۴، ۶۵)

”بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔“

۲۔ ﴿وَمَنْ يُّعِصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَاِنَّ لَهٗ نَارًا جَهَنَّمَ خُلْدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۙ﴾

(۷۲/ الجن: ۲۳)

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

۳۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيُغْفِرْ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (۴/ النساء: ۱۶۸، ۱۶۹)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشنے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا، تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کافر سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَأَن لَّهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُغْنِيهِمْ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴾ (۵/ المائدة: ۳۶، ۳۷)

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن اس عذاب سے چھٹ جائیں تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔“

۲۔ ﴿ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴾ (۲/ البقرة: ۱۶۷)

”وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔“

قیامت کے مکروں کی نسبت فرمایا:

۳۔ ﴿ قَالِیَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴾ (۴۵/ الحجیة: ۳۵)

”تو آج اس دوزخ سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔“

۴۔ ﴿ الْآرَانَ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ ﴾ (۴۲/ الشوری: ۴۵)

”ہاں کافر اور شرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔“

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہے گا:

۵۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

أَجْمَعِينَ ۗ خَلِيدِينَ فِيهَا ۗ لَا يَخْفَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿١٦٢﴾

(٢/ البقرة: ١٦١، ١٦٢)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔“

٦۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۗ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فِيمَوتُوا وَلَا يَخْفَفُ عَنْهُمْ قَرْنَ عَذَابِهِمْ﴾ (٣٥/ فاطر: ٣٦)

”اور ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا، جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مرجائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔“  
شُرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:

٧۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ﴾ (٤/ النساء: ١١٦)

”بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔“

٨۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصَّوْا وَعَن سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ لِقَاءُ فَكُنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾

(٤٧/ محمد: ٣٤)

”بے شبہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔“

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

٩۔ ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَهَنَّمَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ﴾

(٥/ المائدة: ٧٢)

”یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔“

١٠۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا نُفَعِّمُ لَهُمْ آيَاتِ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَهَنَّمَ حَتَّىٰ يَكْبِتَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْجِحَادِ﴾ (٧/ الاعراف: ٤٠)

”بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔“



۱۱۔ ﴿وَلَا يَخْزَنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَكُنُّ يَضَعُوا اللَّهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللَّهُ لَاجْعَلْ لَهُمْ حَقًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۷۶)

”اور اے پیغمبر! تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔ تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آگئے۔

بیاباکیں داور یہاں ابہ پیش داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً: قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل ﴿مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں رزموں کا دھوون کھانے کو ملے گا۔ (۶۹/ الحاحۃ: ۳۳-۳۶)﴾ یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جان تازہ اور حیات نوبخش جی جائے گی۔ (۳/ آل عمران: ۱۶۹) وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر محل اور پینے کے لیے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا:

﴿فِي سَمُومٍ وَصَحِيْبٍ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّخْمُومٍ ۗ لَا يَأْكُلُوْنَ وَلَا كَرِيْمٍ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۗ﴾ (۵۶/ الواقعة: ۴۲-۴۵)

”وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوکوں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بے شرک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔“

روایے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور

﴿حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترک استعمال آل

النبي ﷺ علی الصدقة: ۲۴۸۲؛ ابو داؤد، کتاب الامارۃ، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۵۔

آدھا بد صورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ برے تھے \* اس لیے بد اعمالی بد صورتی اور نیکی خوب صورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں میں مستنبط ہوتا ہے:

① حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوزے پہنائے گا۔“ \*

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی کوئی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنساے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔“ \*

③ ”جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا۔“ \*

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً:

① قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ (۱۷/ الاسراء ۷۲) دیکھو کہ دنیا کی معنوی و قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری و جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

② حدیث میں ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی۔ \* دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

③ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے

\* صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلاة الصبح: ۷۰۴۷۔

\* ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب فی ثواب الاطعام: ۲۴۹۰۔

\* ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الستر علی المسلمین: ۱۹۳۰۔

\* ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس: ۱۹۲۴۔

\* ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء فی شدة الوہد للمتكبرین: ۲۴۹۲۔

گا۔“ صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ”جو شخص بلاوجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا۔“ دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ ”دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا۔“ ایک پہلو کا عدم ادا کی حق اپنی تمثیلی صورت ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہیں پر جزا سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے سے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَغْمًى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى ۝ ﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٤، ١٢٦)

”جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گزارا ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا، فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔“

دیکھو کہ دل کی ناپیدائی قیامت میں ظاہری ناپیدائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمت الہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

### دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

① آتش دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ اَلنَّسَارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے، انہیں معنوں میں السَّعِيرُ یعنی جلنی آگ بھی بار بار مستعمل ہوا ہے اور عَذَابُ الْحَرِيقِ جلن کا عذاب بھی دو چارجگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ((مثل له ماله شجاعا افرع)) کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ: ١٤٠٣ و کتاب التفسیر: ٤٥٦٥۔ ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء من نخل الزکوٰۃ: ٦٥٠، بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سال الناس نكثرا: ١٤٧٤، یروایت سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب المسألة: ٢٥٨٦ و باب حد الغنی: ٢٥٩٣، مسند احمد، ج ٢، ص: ١٥ میں بھی ہے اور سب میں یہ الفاظ ملتے ہیں ”ليس في وجهه مزعة“ لیکن ترمذی جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے اس میں ”ومسئلته في وجهه خموش او خروش او كدوح“ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ”ض“ ترمذی، ابواب النكاح، باب ما جاء في التسوية بين الضرائر: ١١٤١۔

﴿ تَلْفَحُوا وُجُوهُهُمْ النَّارَ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۱۰۴)

”ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔“

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

﴿ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُهُ لَا يُبْقِي وَلَا يُدْرِكُهُ لَوَاحٍ لِّلْبَشِيرِ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۲۷-۲۹)

”اور تمہیں کیا معلوم، سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے

والی۔“

﴿ كَلَّا إِنَّهَا لَأَطْلَىٰ ۖ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴾ (۷۰/ المعارج: ۱۵، ۱۶)

”ہرگز نہیں، وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔“

﴿ إِنَّهَا لَتَرْمِي بِشَرِّهَا لِقَصْرِ ۖ كَأَنَّهُ جِمَلَتٌ صُفْرَةٌ ﴾ (۷۷/ المرسلات: ۳۲، ۳۳)

”دوزخ نخل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔“

② وہاں سایہ نہ ہوگا، بلکہ یہ حکم ہوگا:

﴿ انطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي نَتْلِ ۖ شَعْبٍ ۖ لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ﴾

(۷۷/ المرسلات: ۳۰، ۳۱)

”چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھاٹکیں ہوں گی، نہ گھنی کی چھاؤں اور نہ تیش میں کام

آسکے۔“

③ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

﴿ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴾ (۷۸/ النبا: ۲۴)

”اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔“

④ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

﴿ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ (۲۰/ طہ: ۷۴، ۸۷/ اعلیٰ: ۱۳)

”وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔“

⑤ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

﴿ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ﴾ (۴۷/ محمد: ۱۵)

”اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔“

⑥ اور پیپ پیئیں گے:

﴿ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴾ (۷۸/ النبا: ۲۵)

”لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔“

⑦ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ﴾ (الحج: ۱۹)

”ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔“

⑧ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا:

﴿أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۗ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ ۗ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَبَّيْنِ ۗ

طَلَعَهَا كَاكِبَةٌ رُءُوسِ الشَّيَاطِينِ ۗ وَأَنْهَمُ لِأَكْثَرِ أَهْلِهَا ۗ وَمِنْهَا الْبُطُونُ ۗ ثُمَّ إِنَّ

لَهُمْ عَلَيْهَا نُشُوبًا مِنْ حَمِيمٍ﴾ (۳۷/ والصف: ۶۲-۶۷)

”یاسینڈھے کا پھل..... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کے ٹکڑے جیسے

شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی لمونی

ہوگی۔“

﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ طَعَامٌ لِّأَيِّمٍ ۖ كَالْمُهْلِ ۖ يَغِي فِي الْبُطُونِ ۖ كَغَلِيِّ الْحَمِيمِ﴾

(۴۴/ الدخان: ۴۳-۴۶)

”سینڈھے کا درخت گناہگار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹیوں میں کھولتا ہے، جیسے کھولتا

پانی۔“

⑨ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ۚ لَا يَسْمُونَ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعِهِمْ﴾

(۸۸/ الغاشية: ۶، ۷)

”اور ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی، جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے

بے پروا کرے گی۔“

⑩ رخصوں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسِيلِينَ﴾ (الحاقة: ۳۶)

”اور نہ کوئی کھانا، مگر رخصوں کا دھوون۔“

⑪ کھانا لگا نہ جائے گا:

﴿وَطَعَامًا ذَا غَصَّةٍ﴾ (المزمل: ۱۳)

”اور گلے میں اکتنے والا کھانا۔“

⑫ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا:

﴿فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَارٍ﴾ (الحج: ۱۹)

”کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔“

13) لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

﴿وَلَهُمْ مَقَامٌ مِّنْ حَدِيدٍ﴾ (الحج: ۲۲)

”اور ان کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔“

14) گلے میں طوق اور زنجیریں:

﴿إِذَا أَعْلَلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ يُسْحَبُونَ﴾ (المؤمن: ۷۱)

”جب انکی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔“

﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلْسِلًا وَأَعْلَالًا وَسَعِيرًا﴾ (الذہر: ۴)

”ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار کر رکھی ہے۔“

﴿مُقْتَرَبِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ (ابراہیم: ۴۹)

”وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔“

دوزخ میں روحانی سزائیں

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گزر چکا ہے، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا:

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ﴾ (الهمزة: ۶، ۷)

”سلائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔“

﴿وَأَسْرُوا الْعَذَابَ﴾ (یونس: ۵۴)

”اور جب عذاب کو دیکھیں گے، تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔“

﴿يَجْسَرُنِي عَلَى مَا كَفَرْتُ فِي جَنبِ اللَّهِ﴾ (الزمر: ۵۶)

”اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔“

﴿كُلُّكُمْ آرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ﴾ (الحج: ۲۲)

”وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔“

ذلت کا عذاب

﴿فَالْيَوْمَ مَجْزُونٍ عَذَابَ الْهُونِ﴾ (الاحقاف: ۲۰)

”تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔“

اس افسوس و حسرت و ندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

﴿ لَا تَعْتَدِرُوا الْيَوْمَ ﴾ (٦٦/التحریم: ٧) ” آج معذرت نہ پیش کرو۔“

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا، جب وہ بات کرنا چاہیں گے، تو وہ فرمائے گا:

﴿ اخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴾ (٢٣/المؤمنون: ١٠٨)

”ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے:

﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُورُونَ ﴾ (٨٣/التطفييف: ١٥)

”ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔“

اُن میں سے وہ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی

رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:

﴿ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنسى ﴾ (٢٠/طلہ: ١٢٦)

”اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا

جائے گا۔“

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر

بھی نہ دیکھے گا اور نہ اُن سے کچھ بات کرے گا اور نہ اُن کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق

و مہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق و محبت کے زخم

خوردہ ہیں، فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا

يَكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾

(٣/آل عمران: ٧٧)

”جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خرید کرتے ہیں،

وہ یہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان

کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

## جنت

## جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیوکارا انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً «الْجَنَّةُ» (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا، مثلاً: «جَنَّةِ النَّعِيمِ» (نعمت کا باغ) «جَنَّةُ الْخُلْدِ» (بقائے دوام کا باغ) «جَنَّتْ عَدْنُ» (دائمی سکونت کے باغ) «جَنَّةُ الْمَأْوَى» (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً: «فِرْدَوْسُ» (باغ) «رَوْضَةٌ» (چمن) «دَارُ الْخُلْدِ» (ہیشگی کا گھر) «دَارُ الْمُقَامَةِ» (قیام کا گھر) «دَارُ السَّلَامِ» (امن و سلامتی کا گھر)

## جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں بھی گولڈ تیس اور مسرتیس ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت فانی ہے یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیر کی بعد بھوک، ہر سیرانی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلین اٹھانے اور ہزاروں صدے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آئی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا: اے آدم!

﴿هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ هَجْرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٠)

”کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔“

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جھدر کا راستہ بتایا وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جہنم اٹلدا اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

﴿أَمْرُهُ الْخُلْدِ النَّبِيِّ وَعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَاصِيًّا﴾



”یا بیٹنگلی کا باغ، جس کا وعدہ پر ہمیں زگاروں سے کیا گیا، جو ان کا صلہ ہوگا اور وہ جسی کی جگہ۔“  
یہ بیٹنگلی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ہمیشہ، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

۱۔ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

فِيهَا أَبَدًا وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا﴾ (۴/ النساء: ۱۲۲)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔“

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلود و جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے:

۲۔ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

فِيهَا أَبَدًا﴾ (۴/ النساء: ۵۷)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۳۔ ﴿لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(۵/ المائدة: ۱۱۹)

”ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۴۔ ﴿وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (۹/ التوبة: ۲۱، ۲۲)

”اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۵۔ ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

(۹/ التوبة: ۸۹)

”اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۶۔ ﴿وَيُدْخِلُهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(۶۴ / التغابن: ۹)

”اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۷۔ ﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا﴾

(۶۵ / الطلاق: ۱۱)

”اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔“

۸۔ ﴿جَزَاءُ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(۹۸ / البینة: ۸)

”ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں، جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

۹۔ ﴿وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا مَا كُنْتُمْ فِيهِ أَبَدًا﴾

(۱۸ / الكهف: ۲-۳)

”اور ان مومنوں کو بشارت دوں گا، جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے اچھی مزدوری ہے، جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔“

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

۱۰۔ ﴿هَذَا مَا توعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ إِنَّ هَذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ لَفْظٍ﴾

(۳۸ / ص: ۵۲، ۵۴)

”یہ وہ ہے، جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی، جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔“

۱۱۔ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَمَنْ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرُ مَجْذُومٍ﴾

(۱۱ / ہود: ۱۰۸)

”اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں،

لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔“  
یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہوگی:

۱۲۔ ﴿وَجَدْتِ لَهُمْ فِيهَا نُعِيمًا مُّقِيمًا ۝﴾ (۹/ التوبة: ۲۱)

”اور وہ باغ، جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔“

۱۳۔ ﴿أَكْلَاهَا دَائِمًا وَظِلُّهَا ۝﴾ (۱۳/ الرعد: ۳۵)

”جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔“

۱۴۔ ﴿وَقَالَتْ كَيْفَ يَكْفُرُونَ ۝ لَا مَقْطُوعَةَ وَلَا مَمْنُوعَةً ۝﴾ (۵۶/ الواقعة: ۳۲، ۳۳)

”اور بہت سے میوے، جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔“

۱۵۔ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝﴾ (۹۵/ التين: ۶)

”لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے، جس کا سلسلہ کبھی ختم

نہ ہوگا۔“

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، پہلی صورت کی نفی تو گزشتہ آیتوں میں کر دی گئی ہے کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو ﴿خال الدین ابدا﴾ کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گزرنہ ہوگا، فرمایا:

۱۶۔ ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۝﴾ (۴۴/ الدخان: ۵۶)

”جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔“

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرمادی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

﴿لَا يَسْتَهْمُّ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝﴾ (۱۵/ الحجر: ۴۸)

”وہاں ان کو کوئی تم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔“

یہ بھی ممکن ہے، کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں، تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی

کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

﴿ خَلِيدِينَ فِيهَا لَا يَبْعُونَ عَنْهَا جَوْلًا ﴾ (۱۸ / الکہف: ۱۰۸)

”سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔“

دوام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس توہرتو تا کید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقا راحت دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے ﴿ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَى ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰) ”اور غیر فانی سلطنت۔“

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالم بقا سے ان کو اس عالم فنا میں بھجوادیا، آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ ”بادشاہی“ کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری کے دینے کے لیے کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زرو جو اہر کے برتن، زرین کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمر دیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہم جہیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازم ہیں۔ جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدم کے دشمن نے، آدم کے سامنے کی تھی:

﴿ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَى ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰) ”اور غیر فانی بادشاہی۔“

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پہلے اور مادیت کے ماحول میں پھلے پھولے ہیں، کسی خالص روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو انہیں لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موثری خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ وہ نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت

عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

”میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیانہ پیوں۔“ (متی ۲۶-۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ”باپ“ کی ”آسمانی بادشاہی“ میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا، اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا، تو وہ اس کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جوہرات کی دیواروں میں نظر آئی۔ (مکاشفات یوحنا باب (۲۲ و ۲۳) اور پھر ”وہاں رات نہ ہوگی اور وہ چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوندان کو روشن کرتا ہے اور وہ ابد الابد بادشاہی کریں گے۔“ (۵-۲۲)

لیکن یہ ”بادشاہی“ عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

﴿فَوَقَّهْمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْمُ نَضْرَةً وَسُورَةً وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْبَابِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذَلَّلَتْ فَئُوقَهَا تَذَلُّلًا وَيَطَافُ عَلَيْهِمْ بِأَنْبِيَاءٍ مِنْ فَضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا قَوَارِيرًا مِنْ فَضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا عَيْنًا فِيهَا تُسْقَى سَلْسِيلًا وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَنَنْوَرًا وَإِذَا رَأَيْتَ لَمْ تَرَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلَكًا كَبِيرًا عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوْا أَكْسَاوِرَ مِنْ فَضَّةٍ وَسَقَّهْمُ رُبَّهْمُ شَرَابًا طَهُورًا إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيَكُمْ مَشْكُورًا﴾ (۷۶ / الدهر: ۱۱-۲۲)

”تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا اور ان کو تروتازگی اور شاد کامی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو رہنے کے لیے باغ اور پہننے کے لیے ریشمی کپڑے دیے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈا دران کے سایے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرائی شیشوں کے آنچورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونھ ملی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام، سلسیل ہے اور سردار رہنے والے کسن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے

کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی نگین پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔“

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ مخلوق کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا، عرض کرے گا خداوند! میں راضی ہوں، فرمائے گا: تیرے لیے اتنا اور اس سے دو گنا اور اس سے تین گنا اور چو گنا ہے، کہے گا: خداوند! میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا: تیرے لیے وہ اور اس کا دس گنا ہے۔ عرض کرے گا، میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا: اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشنے۔“

### باغ کا استعارہ

آخرت کے خانہ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں، بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و چراغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطا راضی میں آباد ہو، مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات، باغ و بہار اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے

جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، ومن سورة السجدة: ۳۱۹۸ (حدیث حسن صحیح)

وہ ہر گم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحان بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحی محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے، تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے گی۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

﴿وَيَسِّرُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأَنْتُمْ بِهَا مُتَسَاهِلُونَ ﴿٢٦﴾ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَثَلًا مَا بَعُوْهُ فَمَا كُفِرُوا﴾ (البقرة: ۲۵، ۲۶)

”اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ، جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے، کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں رہا کریں گے بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔“

ان آیتوں کے سیاق و سباق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی و لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قَدْرَةِ غَيْبٍ ۚ جَزَاءُ يَسَاءَ كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾﴾

(۳۲/ السجدة: ۱۷)

”تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔“

اس آنکھوں کی ٹھنڈک ”یعنی لذت و راحت“ کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس

لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا:

((قال الله اعددت لعبادى الصالحين مالا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر)) ❁

”خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔“

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زپوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے خیال میں گزریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

((بله ما اطلعتم عليه)) ❁ ”جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔“

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((بله ما اطلعكم الله عليه)) ❁ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ”بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔“ دوسرے یہ ”خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو۔“

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبه شیء مما فی الجنة ما فی الدنیا الا فی الاسماء.

”سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ابو ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔“ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((لیس فی الدنیا مما فی الجنة الا الاسماء)) ❁

❁ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۹۸ و کتاب التفسیر: ۴۷۷۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة: ۷۱۳۴ و ترمذی ابواب التفسیر: ۳۱۹۷۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة السجدة: ۴۷۸۰۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعمتها: ۷۱۳۳۔ ❁ تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۱۳۳۔ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۳۸۔



”جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔“

غرض ان الفاظ سے انہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لہذا نڈ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نا دیدہ و ناشنیدہ اور ردول ناخلیدہ مفہیم کے لیے ان کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لیے قرآن پاک نے بہ تصریح تمام یہ کہا ہے:

﴿إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۵۲/ الطور: ۱۶)

”وہی بدلہ پاؤ گے، جو تم کرتے تھے۔“

حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت میں خدا فرمائے گا: اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں، جو تم کو واپس مل رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔“ \*  
مثلاً: وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزیاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن و امان اور سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو:

﴿قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَذَابَ السَّمُورِ﴾

(۵۲/ الطور: ۲۶، ۲۷)

”کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے، تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچالیا۔“

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر و غضب کی تمثیل شعلہ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو بادِ سوم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دو متمند و قوی دست منکرین، کمزور اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے۔ قیامت میں اس کا الٹا ہوگا یہ ان پر پُٹنسیں گے۔ فرمایا:

\* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۲۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۖ وَإِذَا آمَنُوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۖ وَإِذَا انقلبوا إلىٰ أهلهم انقلبوا فكهين ۖ وَإِذَا آراؤهم قالوا إن هؤلاء لضالون ۖ وما أرسلنا عليهم حفizin ۖ فاليوم الذين آمنوا من الكفار يضحكون ۖ﴾

(۸۳/التطيف: ۲۹-۳۴)

”بے شک گناہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے..... تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسی لگائے۔“  
نیوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندہ مسرت میں بدل گئے اور گناہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گناہگار جو دنیا میں اپنی دولت و قوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش اور سرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور سرور ہوں گے:

﴿فَسَوْفَ يَدْعُونَ بُنُورًا ۖ وَيَضلُّ سَعِيرًا ۖ إِنَّهٗ كَانَ فِيٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۖ﴾

(۸۴/الانشقاق: ۱۱-۱۳)

”تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔“

اور غریب و مسکین جو وہاں اہل و عیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھے، ان کا یہ حال ہوگا کہ

﴿فَسَوْفَ يَحَاسِبُ حِسَابًا يَّسِيرًا ۖ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۖ﴾

(۸۴/الانشقاق: ۸، ۹)

”تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔“

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

﴿وَيَسِّرُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَدَّتٍ حَجْرِيٍّ مِنْ حَبْطِ الْأَثَرِ ۖ﴾

(۲/البقرہ: ۲۵)

”اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باغ کی خوش خبری سنا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشوونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں، تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود عدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

﴿وَأَدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ يُحْبَبُونَ فِيهَا سَلَمٌ ۖ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝﴾ (۱۶/ ابراہیم: ۲۳-۲۵)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کی وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک سترے درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔“

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ”اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے۔“ تو دوسرے میں ہے کہ ”وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا۔“ کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے، جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہ ذی النہد نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی ہے، انھوں نے آ کر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا: ((ذالك عمله يجزي له)) ”یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہ رہی ہے۔“

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہا درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہا باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جاسکتی ہے، علوم نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

واكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل ..... وبالجملة فتشبهات

تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱۳، ص ۱۲۰۔

صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب العین الجاریة فی المنام: ۷۰۱۸۔

وتمشلات لَمَاعِنْدَهَا ..... وتَشْبَعُ النِّعْمَةُ بِمَطْعَمِ هَنْتَى وَمَشْرَبِ مَرِيثَى  
وَمَنْكَحِ شَهْوَى وَمَلْبَسِ رِضَى وَمَسْكَنِ بَهْوَى۔ ❁  
”حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں..... حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں  
میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے..... اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے،  
خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں  
نمایاں ہوگی۔“

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں  
اور کیونکر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی  
اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاد و قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اس کی اطاعت، جس کو حقوق  
اللہ کہتے ہیں اور دوسری بندگان الہی کے ساتھ حسن سلوک، بندگان الہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے  
وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی  
کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں انہیں کی نسبت ہم ان  
کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں انہیں پانچ قسموں میں منحصر ہیں۔  
ایمان و اخلاص و اطاعت کی جزا وہ خود تبارک و تعالیٰ ہے، وہ اپنے ویدار سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا  
حسین و مہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم  
تعم کے الوان طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے،  
پہنانے کی جزا ایشیم و حریر و بیاد و طلسم اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں حسن سلوک کی  
جزا، خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَيْهِ السَّلَامُ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۖ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَىٰ ۖ﴾

(۲۰/ طہ: ۱۱۸، ۱۱۹)

”بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ ننگا اور پیاسا ہونا، نہ دھوپ  
میں رہنا۔“

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحہ کی  
بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے، جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا ہے، نہ ننگا ہونا،  
نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر و طرح سے کی جاسکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت

میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لوکی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں ہمیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزرنہ ہوگا۔ یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے، وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے۔ انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی مسرت کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلّتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اسی طرح پاکیزہ زندگی گزارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام، کھانا، پینا، پہننا، رہنا ہے اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں جو ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوان طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَتَا مَنْ طَعَىٰ ۖ وَالْأَثَرِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ الْحَيِمَةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ

رَبِّهِ وَهَيَّ النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ﴾ (النّازعات: ۳۷-۴۱)

”پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے، لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔“

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلچیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿وَأَمَّا تَوْفُونَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ﴾ (آل عمران: ۱۸۵)

”اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔“

## لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخر ان کی انتہا انہیں باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ذریعہ کر دی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں، وہ یہی ہیں باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زرد و جوہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سہ کاری اور گناہگاری کی مرتکب ہوتی ہے اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو دہاں ملیں گی، وہ ہمارے انہیں عادی دمانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

## لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنالینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے، جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی:

﴿جَنَّتٌ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُجْرَبُونَ مِنْ حَتَّىٰ تَمُوتَ الْأُنْثَرُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي

اللَّهُ الْمُتَّقِينَ﴾ (النحل: ۳۱)

”رہنے کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں ان کے لیے ان باغوں میں وہ ہے، جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔“

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ﴾ (۴۱/ حَم السجدة: ۳۱)

”اور تمہارے لیے جنت میں وہی ہے، جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے، جو تم مانگو۔“

﴿لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ﴾ (۵۰/ ق: ۳۵)

”ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔“

﴿ وَفِيهَا مَا كَشَفْتُمُوهَا مِنَ الْأَنْفُسِ وَكَذَلِكَ الْأَعْيُنُ ﴾ (٤٣/ الزخرف: ٧١)

”اور جنت میں وہ ہے، جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔“

﴿ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۗ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا ۝﴾ (٢٥/ الفرقان: ١٦)

”ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔“

﴿ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ﴾ (٣٩/ الزمر: ٣٤)

”ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں گے۔“

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہم نے ارشاد فرمایا کہ ”جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کرو کہ تو اللہ فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر ﴿ یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ ہاں کسی چیز کی کمی ہوگی بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال) ﴿

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیار یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا، ﴿ ایک بدوی نے پوچھا، یا رسول اللہ رضی اللہ عنہم! وہاں گھوڑے بھی ہوں گے؟ فرمایا کہ ”اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یا قوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا۔“ دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ رضی اللہ عنہم! اونٹ بھی ہوگا؟ فرمایا: ”اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔“ ﴿

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے۔ اس لیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حتیٰ يتخيل اليه) ﴿ کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ ﴿

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

﴿ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب آخر اهل النار..... ٤٦٢ - ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب

ما جاء في سوق الجنة: ٢٥٥٠ - صحيح بخاری، كتاب الحرف والمزارعة: ٢٣٤٨ -

﴿ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في صفة خيل الجنة: ٢٥٤٣ - ترمذی، میں ”اليه“ کے بجائے

”عليه“ کے الفاظ ہیں۔ ﴿ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في سوق الجنة: ٢٥٤٩ -

ع بہشت آنجا کہ آزار نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کاٹنا نہ چھ رہا ہو یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گزشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۱۰ / یونس: ۶۲)

”نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھر بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینا اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوشش کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے:

﴿جَلَّتْ عَدْنٌ يَدُ خُلُونَهَا يَجْلُونَ فِيهَا مِنْ آسَاوٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأُلُؤَاءٌ وَلِيَا سُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ  
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ  
الْمَقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ لَآ يَسْتَأْذِنُ فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَسْتَأْذِنُ فِيهَا الْقُؤُوبُ﴾

(۳۵-۳۳: فاطر: ۳۵)

”رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکانا ہے۔“

﴿لَآ يَسْتُهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُحْرَجِينَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۸)

”اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔“



## جنت جہاں رشک و حسد نہیں

موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم دلی کے ساتھ سنگدلی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بغض و حسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض و حسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ فرمایا:

﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا﴾ (۱۹ / مریم: ۶۲)

”اس میں امن و سلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔“

﴿وَلَنُرَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِن غَيْبٍ نَّجْوَىٰ مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾ (۷ / الاعراف: ۴۳)

”اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“

﴿وَلَنُرَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِن غَيْبٍ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرٍّ مَّقْتُلِينَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۷)

”اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا، بھائی بن کر تھتوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔“

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم

بغض و کینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔“ ❁

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت و شراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکون و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوگی یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوائے ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اہل جنت کھائیں گے اور پیئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھناؤنی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہو گے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی

❁ صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنة و اهلها: ۷۱۰۱۔

چودھویں کے چاند کی طرح۔“ ❁

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ نہ کر آ مادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب و گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو نہ کر آ مادہ انکار ہوں تو ان کا بھی یہ فعل دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے

مادی و جسمانی خلقت و فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانی تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے، لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اڑ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يَرْتُؤْنَ الْفُؤْدُؤْسَ ط هُمْ فِيهَا خُلِدُؤْنَ﴾ ۛ وَكَلَدْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلْدَةٍ مِّنْ طِينٍ ۛ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي فَرْدٍ مَّكِينٍ ۛ ثُمَّ خَلَقْنَا النَّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَلَكَؤْنَا الْعِظْمَ لُحْمًا ۛ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۛ فَتَبَرَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ط﴾ (المؤمنون: ۱۱-۱۴)

”جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں صدارت ہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو توٹھرا بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔“

❁ یہ احادیث صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنة وأهلها: ۷۱۵۲ تا ۷۱۵۶ میں ہیں۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رُک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اس طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد، فرمایا:

﴿ثُمَّ آتَاكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَيْتُونَ ۗ ثُمَّ آتَاكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَبْعُونَ ۗ﴾

(۲۳/ المؤمنون: ۱۵، ۱۶)

”پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔“

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صد ہا ہزار ہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔ یہاں مسئلہ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے صلح کہتے ہیں، ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد انہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی و نباتی حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔ بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا، بلکہ وہ بقدر استعداد و تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۗ﴾ (۹۵/ التین: ۶)

”ان بہشتیوں کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔“

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے:

﴿نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورًا وَاعْفُ عَنَّا إِنَّكَ عَلَىٰ

كُلِّ شَيْءٍ عَاقِلٌ ۗ﴾ (۸/ التحریم: ۸)

”ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوزے گا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے

نور کو کامل کر اور ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے۔“  
 مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔  
 امن و سلامتی کا گھر

انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن و سلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن و سلامتی کی ایک دنیا ملے گی وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرة المنتہی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدی ﷺ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا، جس کے معنی امن و سلامتی کے گھر ہیں۔  
 اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۶/ الانعام: ۱۲۷)

”ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر ﷺ کو مبعوث فرمایا، وہ حقیقت میں اسی امن و سلامتی کی نویدِ بشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۵)

”اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔“

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی ”لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوائے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔“ ﴿جنت کے ذکر میں امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درود یوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۗ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾

(۱۳/ الرعد: ۲۳، ۲۴)

”اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے

صبر کیا تھا تو کیسا اچھا بچھلا گھر ہے۔“

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

﴿إِلَّا قِتْلًا سَلَامًا سَلَامًا﴾ (۵۶/ الواقعة: ۲۶) ”لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔“

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے:

﴿إِذْ خُلُوْهَا بِسَلَامٍ ۙ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴾ (۵۰/ ق: ۳۴)

”اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔“

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا كَلِمًا سَلَامًا﴾ (۱۹/ مریم: ۶۲)

”اس میں سلامتی کے سوا اور کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔“

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین (امن والا مقام) بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ﴾ (۴۴/ اللخان: ۵۱)

”بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔“

مقام رحمت

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا، اس کی رحمت اور فیض و کرم کی وہاں بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا:

﴿يَبْتَئِرُ هُمْ رُدِّيْهِمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَوَجَدْتُمْ لَهُمْ فِيْهَا نَعِيْمًا مُّقِيْمًا﴾

(۹/ التوبة: ۲۱)

”ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جن میں ان کے

لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔“

اہل جنت کے چہرے خوشی سے دسکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی:

﴿وَاَقْرَأَ الَّذِيْنَ اَبْيَضَّتْ وَجُوْهُهُمْ فَنفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۰۷)

”لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اس میں وہ سدا رہیں گے۔“

مقام نور

جنت کا نور وہ مقام ہے، جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے،

کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا:

﴿نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ﴾ (التحریم: ۸)

”ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔“

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

﴿يَوْمَ تَكْرَى الْمُنُفِقِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرًا لَكُمْ الْيَوْمَ جَدَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

(۵۷/ الحديد: ۱۲)

”جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کر دو گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لیے روشنی ہو جائے:

﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُوا نَارًا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾

(۵۷/ الحديد: ۱۳)

”جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی کر لیں۔“

### مقامِ رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشدودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورہ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دے گئی ہے:

﴿يَبْشُرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَدَّتْ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمًا مُقِيمًا﴾

(۹/ التوبة: ۲۱)

”انکا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان بانگوں کو جن میں نعت الہی قائم رہے گی۔“

سورہ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الہی کے بعد بطور تکرار جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

﴿وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ الْعُرُورُ ۗ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَحَسَنَةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۗ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝﴾  
(۵۷/ الحدید: ۲۰، ۲۱)

”اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے، جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا مہربانی والا ہے۔“

سورہ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ۗ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵)

”جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔“

سورہ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعت رضوان الہی کو قرار دیا ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكَنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۗ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾  
(۹/ التوبة: ۷۷)

”اللہ نے ایمان مردوں اور عورتوں سے ان بانگوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے سحرے گھر اور اللہ کی رضامندی، سب سے بڑی ہے وہی بڑی کامیابی ہے۔“

بہشت کی مطمئن رحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَةً ۝﴾

(۸۹/ الفجر: ۲۷-۲۸)

”اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔“

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ط﴾ (۵/ المائدة: ۱۱۹)

”خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔“

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ ”خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے۔ عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تم نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گزشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے، اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔“

مقام طیب و طاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاک، سٹھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

﴿طَيْبُهُمْ فَاذْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۳)

”تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔“

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک و صاف ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنفَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَنَجْزِيَنَّهُمْ

أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾ (۱۶/ النحل: ۹۷)

”مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں

گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔“

جو گھر وہاں ملیں گے، وہ بھی پاک و صاف اور ستھرے ہوں گے:

﴿وَمَسَاكِنٌ طَيِّبَةً ۖ﴾ (۶۱/ الصف: ۱۲) ”اور پاک گھر۔“

جو بیویاں ملیں گی، وہ بھی پاک ہوں گی:

صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة

نعمها واهلها، باب احلال الرضوان ... ۷۱۴۰۔



﴿ وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵) ”اور پاک بیویاں۔“

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿ وَهَدُّوْا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۗ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۴)

”اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔“

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی:

﴿ شَرَابًا طَهُورًا ۗ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۲۱) ”پینے کی پاک چیز۔“

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک و صاف، طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

### مقام تسبیح و تہلیل

اس آرام و لطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الہی برستے ہیں، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہیں، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

﴿ دَعُوهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ فِيهَا سَلَمٌ ۗ وَأُخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ

الْعَالَمِينَ ۗ ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۰)

”جنت میں ان کی ندایہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی

ہوگی اور ان کی آخری پکاریہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔“

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی پر لطف راہیں وہاں

ان پر کھلیں گی، فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَدْعُ الْذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُجْلُونَ فِيهَا

مِنْ أَسْوَدٍ مِنْ ذَهَبٍ وَيُلَوِّظُونَ لِيَا سَاهُمْ فِيهَا حَرِيرًا ۗ وَهَدُّوْا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۗ

وَهَدُّوْا إِلَى صِرَاطٍ الْحَمِيدِ ۗ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۳، ۲۴)

”بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی

پوشاک اُن میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں

گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔“

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکر یہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الہی کا سرود سردی گائیں گے اور یہ

وہ وقت ہوگا، جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَأَدْخَلُوها خُلْدِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ  
صَدَقْنَا وَعَدَّةً وَأَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَّبِعُوْا مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۚ فَيُعْمَرُ اَجْرُ الْعَمَلِيْنَ ۝  
وَيَكْرِي الْمَلِكَةَ حَافِيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقَضٰى بَيْنَهُم بِالْحَقِّ  
وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝﴾ (الزمر: ۷۳-۷۵)

”جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے، تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور یہ دیکھے گا کہ فرشتے عرش الہی کو گھیرے اپنے پروردگاری حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ہم ہوسارے عالم کے پروردگار کی۔“

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا الْقَوْلَ الْاِسْلَامَ وَلَهُمْ فِيْهَا بَكْرَةٌ وَعَشِيَّةٌ﴾ (مریم: ۶۲)

”وہ نہ سنیں گے وہاں بیکاریات، گھر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔“

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر سے جانتا ہوں، صبح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

﴿يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بَكْرَةً وَعَشِيَّةً﴾

”وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اہل جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے

گا۔“ ﴿اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

﴿وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۗ وَهَدُوْا اِلَى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝﴾ (الحج: ۲۴)

”اور اچھی بات کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔“

مقامِ قرب

اہل جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان سب کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے

صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة: ۷۱۵۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب

فی صفات الجنة: ۷۱۵۵؛ سنن دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة ونعيمها: ۲۸۲۸۔

اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جا بجا ان کے لیے یہ آتا ہے کہ ﴿جَزَاءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ”ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے۔“ یہ قریب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهْرٍ فِي مَقْعَدِ صَدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾

(۵۴/ القمر: ۵۴، ۵۵)

”بے شک پرہیزگار، باغوں میں اور نہروں میں، سچائی کی نشست گاہ میں، اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔“

دیدار

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی یا وہ نور مطلع کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کامرکز بن کر نمودار ہوگا اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی:

﴿وَجُوهٌ يُّؤَمِّنُونَ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ﴾ (۷۵/ القيامة: ۲۲، ۲۳)

”کننے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔“

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔“ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا۔“ اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا جمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی:

﴿يَحْيِيهِمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ﴾ (۴۴/ الاحزاب: ۴۴)

”ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی۔“

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا:

﴿سَلَامٌ قَوْلًا قَرِينٌ رَّحِيمٌ﴾ (۳۶/ يس: ۵۸)

صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ: وجوه یومئذناضرة: ۷۴۳۶۔

”رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیامِ سلامتی ہوگا۔“

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔“ ❁

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اس کو اسماء و صفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ

ع بیباکیں د اور بیہار ابہ پیش د اور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر

اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گزر چکے ہیں، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مرکزی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھی، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورہ ق کی تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف انکا انکار قرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔ یاد ہو گا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا:

اموت ثم بعث ثم حشر

حدیث خرافة یا ام عمرو

”کیا مرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا“

اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔“

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز و انکار، رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا:

”ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔“ ❁

وانا لنرجوا فوق ذالک مظهرًا

”اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔“

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ ”جنت یا رسول اللہ؟“ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ”ان شاء اللہ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں

❁ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب یوم القیامة مع الایماء وغیرہم: ۷۵۱۲۔

❁ اصابہ، ج ۶، ص: ۲۱۹، استیعاب ذکر نابغة جمعدی، ج ۱، ص: ۳۲۱۔

ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا، جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروا نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کاپٹنے لگے، اعمال کی جواب دہی سے ترساں ولرزیاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیرا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کی دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کا خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بد اعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے غموں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا: ”میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں۔“ یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ ❁

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدائے تھے، نبیوں سے مالا مال جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ”اگر وصال نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر ہیں تو میں بھی خوش ہوں ❁ اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الہی دوزخ نہ ملے۔“ وہ نزع کے حال میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا: ”خدا کی قسم! اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا۔“ ❁ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: ”اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی ❁ اے کاش میں کچھ نہ ہوتی“ ❁

❁ سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۳۰۸۴۔

❁ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: ۳۹۱۵۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب

النبی ﷺ، باب مناقب عمر: ۳۶۹۲۔ ❁ ابن سعد جزء النساء، ج ۸، ص: ۵۱۔

❁ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۱۹؛ مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۷۶۔

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب موثر آیت:

﴿يَأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوُنَّهَا تُذْهَبُ كُلُّ مَرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَرَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝﴾ (الحج: ۱، ۲)

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور بیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے، لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔“

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ روایت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آرہا ہے، ادھر تین سو نپتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں: ”لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے۔“ ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں ”ہاں۔“ وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپ دریافت فرماتے ہیں کہ ”تم نے واہ واہ کیوں کہا؟“ عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں۔ فرمایا: ”تم اس میں ہو۔“ یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گزرا بولے، اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوہ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا احد کے میدان میں دارو گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا: ”جنت میں۔“ وہ کھجور کھا رہے تھے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی، قیس ایک

صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الحج: ۴۷: ۱۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۱۶۸۔

سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب التعود من القبر: ۲۰۶۴۔

جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی الریاء والسمة: ۲۳۸۲۔

صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشہید: ۴۹۱۵۔ صحیح مسلم، کتاب الامارة،

باب ثبوت الجنة للشہید: ۴۹۱۳؛ سنن نسائی، کتاب الجہاد، باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ: ۳۱۵۶۔

صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔“ ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے؟ انہوں نے کہا ”ہاں“ یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔ ❁

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکر و کافر عرب کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں عربوں کے عقائد اخلاق اور کارناموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

## قضا و قدر

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ۴۹)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن پاک میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلہ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت قدرت اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ما حاصل یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلہ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندس ازل، خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت و حیات، فقر و غنا، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراہ میں حضرت آدم علیہ السلام و شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گزر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸-۱۶۲ تا ۱۶۳ (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم، ص: ۹۹) میں ہے:

”تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔“

اس کے بعد زبور ۱۳۸: ۶۲ تا ۶۳، (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم، ص: ۱۰۴) کا ترانہ حمد اسی نے میں شروع ہوتا ہے:

..... ”خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود

ہو گئے، اس نے ان کو ابدی پائیداری بخشی اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔“

انجیل میں اس کی تعلیم ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی آخری شب کی



دعا میں فرماتے ہیں: ”میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو۔“ (متی ۲۶-۳۹) اور اسی ”مرضی“ کا ذکر یوحنا (۵-۶۳-۲۸) اور خطوط (فلپون ۲-۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویس باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح کی اور اسکی حکمت و مصلحت کی تشریح کی اور دوسری بات یہ کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقت ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر پیدا کر لیا اور یہ تلقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی اور ایسا اس نے اس لیے کیا، تاکہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے، بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیروؤں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و توفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحی محمدی ﷺ نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں ایک ”قدر“ ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا ”قضا“ جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں:

﴿ اِنَّا كُنَّا سَمِيًّا خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝ ﴾ (القمر: ۴۹)

”ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔“

﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ اَجَلًا ۝ ﴾ (الانعام: ۲)

”وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔“

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے، موت و حیات، فنا و بقا اور عروج و زوال، غرض کائنات کی ہر شق اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادے انہیں پر وہ چل رہی ہے۔ قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی

عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْبَيْلُ سَابِقُ النَّهْرِ ۝

وَكُلٌّ فِيْ فَلَکٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ (یس: ۳۸-۴۰)

”اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوثا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔“

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا﴾ (٤١/ ختم سجدة: ١٠)

”اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔“

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا:

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (٦٥/ الطلاق: ٣)

”اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے۔“

موت و حیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

﴿تَحْنُ قَدْرًا نَأْبِتُكُمْ الْمَوْتَ﴾ (٥٦/ الواقعة: ٦٠)

”ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔“

ہر شے میں اللہ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ فطرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام متعین فرمادیے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی و زوال، موت و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت، ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرمادیے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (٦٤/ النعابن: ١١)

”نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت، لیکن اللہ کے حکم سے۔“

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدرات کو نوہنۃ الہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹی اور بھوتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹیں اور بھولیں نہیں:

﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۗ وَمَا يُعْتَرُ مِنْ مَّعْتَرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۗ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾

(٣٥/ فاطر: ١١)

”اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنمتی ہے، لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی

درازی ملتی ہے، یا اس کی عمر کم ہو جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔“

اس آیت پاک میں دو کلمے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ ضعیف ہے، وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا کلمہ یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں کلموں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الہی میں ہونا اور علم الہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست و گیری کرے اور وہ یہی عقیدہ قضا و قدر ہے۔ اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدوجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورہ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

﴿ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا وَإِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۗ لَّيَكِيلًا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَاكُنْتُمْ وَلَا تَنْفَرُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلًّا فَتَنًا ۗ ﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۲، ۲۳)

”کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لیے کیا گیا، تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔“

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گردنیں عین کامیابی و

فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمتِ الہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہا لے جاسکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كُتِبَ مُوَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ كُتَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۗ وَمَنْ يُرِدْ كُتَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۗ وَسَتَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيِّ قُتِلَ لَمَعَهُ يَرْيَدُونَ كَثِيرًا ۗ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران، ۱۶۵، ۱۶۶)

”کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھا یا برا ارادہ و نیت ہے، اس نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہونا اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ نست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دوں ہمتی نہیں، بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحبِ وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیوں کہ

﴿ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا ۗ هُوَ مَوْلَانَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَاكِتَوٰكُلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ ﴾

(۹/ التوبة: ۵۱)

”ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی، لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔“

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی مریں

گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے:

﴿يَعْقُودُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْْرِ شَيْءٌ مَّا قَاتَلْنَا هَهُنَا ۖ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵۴)

”منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے قتل میں نکل کر چلے جاتے۔“

﴿أَيْنَ مَا كُنْتُمْ إِذِ دُرُجِكُمْ أَلْمُوتِ ۖ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ﴾ (۴/ النساء: ۷۸)

”تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگرچہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں میں ہو۔“

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت، جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلانے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔ اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی تصدیق تھیں کہ ((اعملوا فکل میسر لما خلق)) ﴿﴾ ”لوگو! اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔“ کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجے کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۖ فَاكَمَا مِّنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَرُكَ لِلْإِسْرَىٰ ۖ

وَأَمَّا مَنْ يَبْخُلْ ۖ فَاسْتَغْلَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيَرُكَ لِلْإِسْرَىٰ ۖ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ

إِذَا تَرَدَّىٰ ۖ إِنَّ عَلَيْكَ لَهْدَىٰ ۖ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۗ﴾ (۹۲/ النبل: ۴-۱۳)

”بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی اور نیکی کوچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اسکی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔“

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق جس کی ثرولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا ملنا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے۔ نیکی کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدم توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ۶۹)

”اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔“

خدا کی طرف سے توفیق و ضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے:

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ (البقرہ: ۲۶)

”اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے، لیکن انہیں کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔“

غرض پہلے فسق، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:

﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۚ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ﴾

(النجم: ۳۹، ۴۰)

”اور انسان کے لیے نہیں، لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔“

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کچھ کوشش کرتا ہے، تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو با معنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الہی اور عمل انسان باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

## جبر و قدر

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ رشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا جس طرح اہل مذہب ارادہ الہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفہ الہیات کے معلم علم الہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادی عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو مشکل بنا سکتے ہیں۔ دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا ہر دھاگے میں یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جایا جائے یا بحث چھڑی تو جبری کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناخ آواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرا یہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر، ہی رہبری کرتا ہے۔ دوسری طرف جو سی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دونوں عینیں تھیں یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا یا یہ کہ تناخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صدائیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین، بر و بحر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں، جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے

تخلیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا: "اے خدا! اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔" (کتاب مقدس عہد جدید، ص ۳۹۶: ۵۰) عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فریچ فاضل موسیوی دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) صفحہ ۷۷ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے۔

شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل مقدمة الكتاب، ص: ۳ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ

اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی نامتوم ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور بلا سبب بُرے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مؤاخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفہ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں مہداتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ”خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا۔“ (۶/ الانعام: ۵۹) اور دوسری طرف وہ کہتا ہے: ”ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔“ (۳۷/ المدثر: ۳۸) یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت، وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور ہے اختیار رہا ہو ((لَمَّا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) \* اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی

\* صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۱۔



وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔ فرمایا:

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (۱۸/ انکھف: ۲۹)

”تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔“

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بنا تا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَالَمِينَ﴾

(۴۱/ فصلت: ۴۶)

”جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَكُلُوا كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۗ وَمِنْهُمْ مَّن يَنْتَظِرُ  
إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىٰ وَكُلُوا كَانُوا لَا بِيصِيرُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ  
النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (۱۰/ یونس: ۴۲-۴۴)

”اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اگر چہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگر چہ وہ نہ دیکھیں، بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔“

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرانا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ لوگوں کو قرآن کی ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکہ ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۗ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾

(۲/ البقرة: ۶، ۷)

”بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں، وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہو اور اس کو تھمبیا یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر بڑگی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر بڑگی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ (۴/ النساء: ۱۵۰)

”بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔“

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جو ہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ ❁  
برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمائے۔ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِأَنبَاءِهِمْ﴾ (۱۰/ بونس: ۹)

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔“

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷/ محمد: ۱۷)

”اور جنہوں نے ہدایت قبول کی، ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔“

ایرانی فلسفہ خیر و شر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا، حالانکہ عربی الفاظ خیر و شر کو اعمال خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت و نعمت و آرام کے اور شر کے معنی غربت و تکلیف و مصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عمل خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا، جیسے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۗ﴾

(۹۹/ الزلزال: ۷، ۸)

”تو جو کوئی چھوٹی برائی کی کرے گا، اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔“

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

❁ قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر و فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

((وَالْقَدْرُ خَيْرٌ مِنْ شَرِّهِ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى)) ❁

”اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔“

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت ورنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ”اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا“ اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الدھر: ۳۰)

”تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)۔“

﴿مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ﴾ (الانعام: ۱۱۱)

”وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔“

﴿وَكُلُّ شَاءَ اللَّهِ لَجْمَعُهُمْ عَلَى الْهُدَى﴾ (الانعام: ۳۵)

”اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔“

﴿فَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَلَكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (الانعام: ۱۴۹)

”تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ (خود) ہدایت دے دیتا۔“

﴿وَكُلُّ شَاءَ اللَّهِ لَهَدَلَكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (النحل: ۹)

”اور اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔“

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے، اس لیے اس مشیت الہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (الکھف: ۲۹)

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۹۳؛ ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر: ۴۶۹۵؛ ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی وصف جبریل للنبی ﷺ الایمان والاسلام: ۲۶۱۰۔

”تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔“

﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ (۷۳/المزمل: ۱۹ و ۷۶/الذھر: ۲۹)

”تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔“

﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ مَائِطًا﴾ (۷۸/النبا: ۳۹)

”سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت پکڑے۔“

﴿إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ (۲۵/الفرقان: ۵۷)

”لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے، مگر کن کے لیے، بہتر ترخ فرمایا:

۱- ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ (۲/البقرة: ۲۶)

”اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو۔“

۲- ﴿فَلْيَتَاذَعُوا أَزْوَاجَ اللَّهِ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

(۶۱/الصف: ۵)

”جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے انکے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔“

۳- ﴿بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۸۳/التطفييف: ۱۴)

”بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔“

۴- ﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ (۴/النساء: ۱۵۶)

”بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔“

۵- ﴿أَضْرَفُوا صَرَفَ اللَّهِ قُلُوبَهُمْ بَأْتَهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ﴾ (۹/التوبة: ۱۲۷)

”وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔“

۶- ﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ﴾ (۷/الاعراف: ۱۰۱)

”اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔“

۷- ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ (۲/البقرة: ۱۰)

”ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔“

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بد اعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اثر ناعلت اور انسانوں کا کفر و گناہ و

نفاق معلول نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کافس، کجی، زنگ، کفر، انصاف، (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا ﴿ اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چنگی کہ خوشبو اڑ گئی۔ اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

﴿ وَكَمْ يَكُنْ لَهُ شُرَكَاءُ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا ﴾

(۲۵ / الفرقان: ۲)

”اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔“

## ایمان کے نتائج

گزشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یومِ آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع ﷺ نے کیا مصلحتیں رکھیں ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہبِ اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے، وہ بحیثیت اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمان داری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال، ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا درو مدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تھا ایمان پر اور نہ عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عمل صالح کی جامعیت پر موقوف ہے ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔“ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت و سبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور ختم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”اے وہ

لوگو! جو ایمان لائے۔“ کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ”اگر تم ایمان والے ہو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ط﴾ (۲/ البقرة: ۱۶۵)

”ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (۲۴/ النور: ۵۱)

”ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے، تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور انہیں لوگوں کا بھلا ہے۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۰)

”ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔“

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱۶۰)

”اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔“

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے اور سورہ مؤمنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

﴿كَذٰلِكَ اَفَلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ النَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِقُرُوْبِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ ..... وَالَّذِيْنَ هُمْ لَا لِمَالِهِمْ وَعَهْدُهُمْ رَعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَىٰ صَلٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون: ۱-۵، ۸، ۹)

”بے شباہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں اوب سے جھکے رہتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں.....“

اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔“  
ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خصوصاً و خشوع، بے کار باتوں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت و پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین و آخرین نشانی ہے اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔ ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثلاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔“ \* امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنَهُمْ خُلُقًا)) \*

”مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبت الہی کے ضمن اور سمیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق بیچ ہیں، فرمایا:

((لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من ولده ووالده والناس اجمعين)) \*

”تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں، جب تک کہ اس کے دل میں میری

محبت، اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔“

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور

اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

((والذي نفسي بيده لا يؤمن احدكم حتى يحب لآخيه اول لجاره ما يحب))

\* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان، ۹۰؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۲۔ \* سنن ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان و نقصانہ: ۶۸۲۔

\* بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول: ۱۴، ۱۵؛ مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ: ۱۶۹۰۔



لنفسہ)) ❁

”قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں، جب تک کہ وہ اپنے بھائی یا بڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لیے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔“

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا: ”جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے، جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے آپس میں سلام پھیلاؤ۔“ ❁

یہ محبت کسی نمائش، ریا، یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا: ”تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔“ ❁ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے؟ فرمایا: ”اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔“ ❁ فرمایا: ”ایمان کی ستر ۷۰ سے کچھ اوپر نشانیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے۔“ ❁ یہ بھی تعلیم دی کہ ”جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے بڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔“ ❁ ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے منادے یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔“ ❁

اس کے بالقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا: ”نفاق کی چار (۴) نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے اگرچہ وہ نماز گزار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی

❁ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان: ۱۷۰، ۱۷۱۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انه لا یدخل الجنۃ: ۱۹۴۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من کرہ ان یعود: ۱۲۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من: ۱۶۶۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام: ۱۶۱ تا ۱۶۳۔ ❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۲۔ ❁ یہ تمام روایتیں صحیحین، کتاب الایمان میں ہیں، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحدیث علی اکرام الجار: ۱۷۳۔ ❁ صحیح بخاری، کتاب الایمان، پیش نظر مسلم ہے۔ باب بیان کون النہی عن المنکر: ۱۷۷۔

جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے۔“ ❁

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جز کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے لیکن اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لیے ﴿اٰمَنُوْا﴾ کے ساتھ ساتھ ﴿وَعَمَلُوْا الصّٰلِحٰتِ﴾ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم وجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے پانچ سو چوراسی (584) ❁ صفحے سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اور اراق کی گراں باری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہو قلم کے ساتھ قافلہ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں ہر چند کہ

رہ روانِ راخستگی راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین

رمضان ۱۳۵۰ھ

❁ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۰؛ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۴۔ ❁ موجودہ ایڈیشن کے لحاظ سے۔





سَيِّدَةُ النَّبِيِّ  
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ